تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

ماہنامہ

مفاہیم

کراچی

دسمبر ۲۰۲۰ء

جلد ۱

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

شمارہ ۲

لیتفقھوا فی الدین

فقہ اکیڈمی

ليتفقهوا في الدين

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

اقبال

من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين

ماہ نامہ

مفاہیم

کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدّین کی روایت کا علم بردار

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب مدظلہ

مدیر

صوفی جمیل الرّحمٰن عباسی

نائب مدیر

حافظ حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- استاذ ابرار حسین
- حافظ سید اسامہ علی
- استاذ عابد علی بھٹی
- مولانا معراج محمد

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک -1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

فہرست

اداریہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔صوفی جمیل الرحمٰن عباسی ۴

درسِ حدیث۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔صوفی جمیل الرحمٰن عباسی ۸

جدید برائیوں سے کیسے بچیں۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر محمد رشید ارشد ۱۰

سوانحِ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔۔۔۔حافظ حماد احمد ترک ۳۱

تفقہ فی الدین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔صوفی جمیل الرحمٰن عباسی ۴۹

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی اور محاکمۂ استشراق۔۔۔مولانا معراج محمد ۶۸

فتاویٰ یسیلونک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دار الافتاء والارشاد ۷۳

اداریہ

توہینِ رسالت کی سزا کے بارے میں چند گزارشات

منافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا ھُوَ أُذُنٌ ''وہ تو کان ہی ہیں'' تو اللہ تعالی نے اس بات کو اذیت رسول قرار دے کر انہیں عذاب الیم کی وعید سنائی۔ جب کان کہنے جیسی ہلکی بات اپنے محبوب کی شان میں اللہ کو گوارا نہیں ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و کردار پر انگلی اٹھانا یا آپ کے ازواج و اولاد پر طعن کرنا، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارٹون بنانا، یا ایسے مکروہ کام کرنے والوں کی حمایت کرنا یا توہین رسالت کے خلاف موجود قانون سازی کو ختم کرنا یا اسے کالا قانون قرار دینا کتنا اللہ کے غضب کو بھڑکانے والا ہے ہم تصور نہیں کر سکتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی گستاخوں کو اس تصریح کے ساتھ قتل کرایا کہ اس نے اللہ و رسول کو اذیت دی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام اور خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین، فقہاے مجتہدین اور علماے راسخین علیہم الرحمۃ سبھی اس پر متفق رہے ہیں کہ جو بھی توہین رسالت کا ارتکاب کرے گا اس کی سزا موت ہے۔

بے ہدایتے سوچتے ہیں آخر ایک شخص، محمد بن عبد اللہ کی توہین کو اتنا بڑا مسئلہ کیوں بنا دیا گیا۔ تو اس کی طرف اشارہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ '' جس نے مجھے اذیت دی اس نے اللہ کو تکلیف دی''۔ (ترمذی) جیسے بادشاہ اپنے سفیروں کی توہین برداشت نہیں کر سکتے اسی طرح اللہ تعالی بھی اپنے پیغمبر اور اپنے نبی کی توہین گوارا نہیں کرتا۔ اللہ تعالی لوگوں کو ہدایت دینا چاہتے ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت کا نور ہیں۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو صراط مستقیم پہ چلانا چاہتے ہیں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رہنما ہیں۔ اللہ تعالی نیکی کو پسند کرتے ہیں تو نبی آخر الزماں نیکی سکھانے والے ہیں اللہ تعالیٰ لوگوں پر رحمت کرنا چاہتے ہیں تو محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم، رحمت اللعالمین ہیں۔ اللہ تعالی، اپنی عبادت کے لیے انسانوں کو بنانے والے ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اس عبادت پہ لگانے والے ہیں۔ اب کوئی بدبخت اس نبی رحمتِ کل زماں ہی کی گستاخی پہ آمادہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ وہ باغی اللہ تعالیٰ کی ہر سکیم کو توڑنا چاہ رہا ہے۔

جہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ گستاخ رسول کی سزا موت ہے وہاں یہ بات بھی واضح ہے کہ اس سزا کا نفاذ کرنا حکومت کی ذمے داری ہے۔ کسی عام آدمی کو نہیں چاہیے کہ وہ قانون کا نفاذ کرتے ہوئے کسی گستاخ کو خود قتل کرے بلکہ چاہیے کہ پولیس کو اطلاع دے کر یہ سمجھے کہ اس نے اپنی ذمے داری ادا کر دی البتہ حکومت اور انتظامیہ کو یہ ذمے داری احسن طریقے سے ادا کرنی چاہیے اور اس حساسیت کا اندازہ کرنا چاہیے جو بالکل صحیح طور پر ناموس رسالت کے بارے میں مسلمانوں کے ہاں پائی جاتی ہے۔

ہم نے لکھا اور ہمارا یہ لکھنا، علمائے کرام ہی کی پیروی میں ہے کہ کسی عام فرد کو قانون ہاتھ میں لے کر گستاخ کا سر قلم نہیں کرنا چاہیے لیکن جس ملک میں امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی ہدایات کے مطابق صدر، اپنے ہی دین، اپنی ہی عدالت عالیہ اور ایوان کے بنائے ہوئے قانون کو ختم کرنے یا کم از کم غیر موثر کرنے کے بیانات دے، جہاں توہین رسالت کی ایف آئی آر کو اتنا مشکل بنا دیا گیا ہو کہ ڈی ایس پی کے بغیر پرچہ کاٹا نہ جا سکے، جہاں یوسف کذاب کے ناقابل ضمانت مقدمے کی سماعت کو جان بوجھ کر دو سال موخر کر کے اس کی ضمانت کا راستہ پیدا کیا جائے۔ جہاں سیشن کورٹ سے سزائے موت پانے والی آسیہ بی بی سے گورنر وقت، ہمدردی و یکجہتی کا اظہار اور ملاقات کر کے تسلی دے، توہین رسالت کے قانون کو کالا قانون کہہ کر اسے ختم کرنے کا اعلان کرے۔ جہاں ہائی کورٹ سے توثیق شدہ سزائے موت کو سپریم کورٹ گواہیوں کو اس بنا پر رد کر کے کالعدم قرار دے کہ گواہوں میں سے کسی نے حاضرین کی تعداد، دو سو بتائی اور کسی نے ایک ہزار، حالانکہ گواہی تعداد کے بارے میں نہ تھی بلکہ ایک فرد کے ایک قول کے بارے میں تھی!! وہ عدالتی نظام جس میں توہین رسالت کے اکثر مجرم ماتحت عدالتوں سے سزا پانے کے بعد اعلیٰ عدالتوں سے بے گناہ قرار دیے جاتے ہوں، جہاں توہین رسالت کے الزام سے باعزت یا بے عزت بری ہونے والوں کو امریکہ اور کنیڈا کی شہریت سے نوازا جائے اور انہیں کانفرنسوں میں شامل کیا جائے اور میڈیا پر ان کی تصویریں دکھائی جائیں تو شمع رسالت کے پروانوں کے دل دکھنا اور جذبات سے بے قابو ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ مہذب اور زیادہ تربیت یافتہ کون ہو سکتا ہے لیکن توہین رسالت دیکھ کر وہ بھی صبر نہ کر پاتے تھے۔ کئی ایک نے بغیر رسول اللہ ﷺ کو بتائے یا اجازت لیے گستاخوں کو واصل جہنم کیا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان گستاخوں کے خون کو ھدر یعنی رائگاں قرار دیا کہ نہ ان کا کوئی خون بہا ہے اور نہ ہی

قصاص۔اب یہاں حدیث رسول ﷺ اور فقہاے کرام کے متفقہ اصول کے خلاف، ایک رائگاں اور گندے خون کو بہا دینے کی ایک عاشقانہ یا جذباتی حرکت کر گزرنے والے کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے تو یہ ایک مزید نادانی ہے جو مسلمانوں کے جذبات کو مزید بھڑکانے والی ہے اس سے ماورائے عدالت قتل میں اضافہ ہو گا نہ کہ کمی!!ہاں فقہائے کرام کے اقوال کی روشنی میں، بغرض تربیت گستاخ کو قتل کرنے والے غازی کو تعزیری سزا دی جا سکتی ہے تاکہ وہ آئندہ قانون ہاتھ میں نہ لے۔

اسلام کے اصول عدل کا تقاضا ہے کہ توہین رسالت کے مجرموں کو شفاف عدالتی کاروائی کی سہولت دی جائے اور عاشقان رسول ﷺ کو ان کے خلوصِ عشق کے اعتراف کے باوجود، گستاخوں کے ماورائے عدالت قتل سے روکا جائے اس لیے کہ بعض دفعہ ناواقفی سے کوئی معصوم بھی قتل ہو سکتا ہے جیسا کہ مبینہ طور پر ابھی حال ہی میں ایک ایسا واقعہ ہوا بھی ہے اور اس مارا ماری سے معاشرہ افراتفری کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔اس کے لیے ایک طرف تو، عوام الناس کو اس حوالے سے اعتماد میں لیتے ہوئے ڈنکے کی چوٹ اعلان کرنا چاہیے کہ جو بھی توہین رسالت کرے گا وہ جرم کی قرار واقعی سزا پائے گا اور دوسری طرف عوام کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام بھی کیا جائے۔ایک طرف تو آپ دینی اقدار کی دھجیاں بکھیرنے والے میڈیا اور تعلیمی نظام کی سرپرستی کریں اور دینی اداروں اور شخصیات کو دبانے کی کوشش کریں اور ساتھ ہی یہ بھی خیال کریں کہ آپ کی عوام معاملات میں عین شریعت کے مطابق ردعمل ظاہر کریں تو یہ امر محال ہے۔یہ بھی ضروری ہے کہ توہین رسالت کا الزام لگا کر ثابت نہ کر سکنے والوں پر تعزیری سزا نافذ کی جائے تاکہ جھوٹے الزامات کا قلع قمع ہو سکے۔اسی طرح اگر کسی مبینہ گستاخ کو قتل کرنے والے کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ قاتل نے کسی ذاتی سبب سے قتل کیا ہے اور اپنے جرم کو چھپانے کے لیے وہ توہین رسالت کا جھوٹا الزام لگا رہا ہے تو اسے قتل کی حقیقی وجہ کے مطابق ہی سزا دینی چاہیے۔

گستاخ رسول ﷺ کی سزائے موت پر اتفاق عام کے بعد، فقہاے کرام کے ہاں بعض جزیات میں اختلاف رہا ہے لیکن اس اختلاف کے باوجود مسلمان سلطنتوں میں یہ سزا نافذ رہی اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جاتا رہا۔لیکن شاید تاریخ میں پہلی بار فقہاے کرام کے ان اختلافات کو، توہین رسالت کے خاتمے یا غیر موثر کرنے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔اگر یہ مذموم کوشش کامیاب ہو بھی جائے اور ناموس رسالت والے قوانین میں لبرل

قسم کی تبدیلیاں کر بھی دی جائیں تو بھی عشق کے قانون نہیں بدلتے، جہاں موقع ملے گا مسلمان، گستاخ کو جہنم واصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے اور آپ کو قانون کی عملداری کا مسئلہ درپیش ہی رہے گا۔ ضرورت اس کی ہے کہ دائیں بائیں سے نکلنے کے بجائے تمام مسلم ممالک، اپنے علاقے میں رائج فقہ کے مطابق توہین رسالت کی سزا پہ عملدرآمد اور عوام کی دینی تربیت شروع کردیں۔

درسِ حدیث

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

﴿عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ رضی اللهِ عنه قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ وَأَهْوَى النُّعْمَانُ بِإِصْبَعَيْهِ إِلَى أُذُنَيْهِ ''إِنَّ الْحَلاَلَ بَيِّنٌ وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لاَ يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ كَالرَّاعِي يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى يُوشِكُ أَنْ يَرْتَعَ فِيهِ أَلاَ وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى أَلاَ وَإِنَّ حِمَى اللهِ مَحَارِمُهُ أَلاَ وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلاَ وَهِيَ الْقَلْبُ''﴾ (رواه البخاري)

''حضرت نعمان ابن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور وہ اپنی انگلیوں سے دونوں کانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو (اپنے ان کانوں سے) سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے: بے شک حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ امور ہیں جن کی حقیقت سے بہت سارے لوگ واقف نہیں ہو پاتے، پس جس نے شک وشبہے والی چیزوں کو چھوڑ دیا، اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچالیا اور جو شک وشبہے والے امور میں پڑ گیا وہ حرام میں مبتلا ہو ہی گیا، (اس کی مثال یوں ہے) کہ جیسے ایک چرواہا بادشاہ کی (ممنوعہ) چراگاہ کے بالکل قریب اپنے ریوڑ کو چرا رہا ہو تو قریب ہے کہ شاہی چراگاہ میں داخل ہو جائے۔ اور خوب سمجھ لو کہ ہر بادشاہ کی (طرف سے عام لوگوں کے لیے ممنوع) ایک محفوظ چراگاہ ہوتی ہے، اور اچھی طرح سن لو کہ اللہ (یہ ممنوعہ) چراگاہ اس کے حرام کردہ امور ہیں (پس ان کے نزدیک بھی نہ جانا)، اور سنو کہ جسمِ انسانی میں ایک لوتھڑا ہے، جب اس لوتھڑے کی اصلاح ہو جائے تو پورے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے اور جب اس لوتھڑے میں فساد ہو جائے تو پورے جسم میں فساد ہو جاتا ہے اور آگاہ رہو کہ وہ لوتھڑا قلب ہے۔

تشریح ومفہوم

بعض حلال وحرام وہ ہیں جو بالکل واضح ہیں جیسے روٹی، پانی، پھل اور میوے کا حلال ہونا اور شراب، خنزیز کا گوشت، زنا اور جھوٹ وغیرہ کا حرام ہونا، ان کی حلت وحرمت سب پر واضح ہے۔ ان دونوں (یعنی حلالِ محض اور حرامِ محض) کے درمیان

کچھ مشتبہ چیزیں ہیں۔ بہت سارے لوگ (یعنی عوام الناس) ان (مشتبہ امور) کا حکم نہیں جانتے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اور امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ اپنے غور و فکر اور اجتہاد سے مشتبہات کا حکم معلوم کر کے بعض پر حلال اور بعض پر حرام کا حکم لگاتے ہیں اور یہ علماے راسخین اور مجتہدین ہوتے ہیں۔ اب عام لوگوں کو بھی مجتہدین کے اس حکم کی پیروی کرنی چاہیے۔ البتہ جو چیز باوجود اجتہاد کے مجتہدین پر بھی مشتبہ ہی رہے تو اس سے سبھی لوگوں کو دور رہنا چاہیے۔

جو شخص شبہے والی چیزوں سے بچتا رہے گا تو اس کی دینداری بھی محفوظ رہے گی اور اس کی عزت بھی محفوظ رہے گی اور جو مشتبہ امور کو اختیار کرے گا تو اس کی دینداری اور عزت دونوں مجروح ہوں گی اس لیے کہ وہ مشتبہ سے آگے بڑھ کر واضح حرام میں بھی مبتلا ہو کر رہے گا۔ اس کی مثال ایسے چرواہے کی ہے جو بادشاہ کی محفوظ چراگاہ کے قریب اپنے جانور کو چَراتا ہو تو خطرہ ہے کہ اس کا جانور بادشاہ کی چراگاہ میں گھس جائے۔ اب اگر کوئی چرواہا چاہتا ہے کہ اس کا جانور شاہی چراگاہ میں داخل نہ ہو تو اس کے لیے اسے چاہیے کہ اپنے ریوڑ کو چراگاہ کی باڑ سے بھی دور ہی رکھے۔ اسی طرح حلال اور حرام کے درمیان مشتبہات ہیں جو چراگاہ کی باڑ کی مانند ہیں پس جس نے حرام سے بچنا ہے اسے چاہیے کہ مشتبہات سے بھی دور رہنے کی کوشش کرے۔ آخر میں یہ بتایا کہ جسم کی صلاح و فساد کا انحصار اصلاحِ قلب پر ہے۔ قلب کی اصلاح سے مراد اس کے جذبات و کیفیات کی اصلاح ہے۔ جب دل ایمان و عرفان سے اور اللہ کی یاد سے منور ہو جائے، دل میں اللہ و رسول اور آخرت کی محبت رچ بس جائے تو اب پورے جسم کی اصلاح ہو گی یعنی تمام جوارح سے نیک اعمال سرزد ہوں گے۔ جب صورت حال اس کے برعکس ہو جائے یعنی جب دل میں شک، کفران، دنیا کی محبت اور حرص و لالچ کا غلبہ ہو جائے تو ان برے جذبات کے زیر اثر تمام اعضا و جوارح سے برے اعمال سرزد ہوتے ہیں۔

دل کی اصلاح کے دو طریقے ہیں: ایک طریقے کی طرف تو اسی حدیث میں اشارہ کیا گیا کہ حرام اور مشتبہ کاموں سے بچے اور حلال اور جائز امور تک خود کو محدود رکھے۔ اس سے دل نورانی ہو گا اور انسان نیکی میں مزید ترقی کرے گا۔ دل کی اصلاح کا دوسرا طریقہ دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نیک لوگوں کی صحبت میں رہے۔ ذکر و اذکار اور تلاوت قرآن میں محنت کرے اس سے بھی دل نورانی ہو گا اور تمام اعمال و معاملات کی اصلاح ہو جائے گی۔

جدید برائیوں سے کیسے بچیں

ڈاکٹر محمد رشید ارشد

یہ دور کہ جس میں ہم رہ رہے ہیں اس کے بارے میں اکثر ہم سنتے ہیں کہ یہ فتنوں کا دور ہے۔ ایمان اور عملِ صالح کے حوالے سے یہ مشکل وقت ہے۔ ایک بات تو خیر ہمیں معلوم ہونی ہی چاہیے کہ انسان کے نفس میں شر کا پہلو ہمیشہ سے رہا ہے اور وہ خِلقی ہے۔ خِلقی ان معنوں میں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی نفس کے اندر کچھ داعیات اور جبلتیں رکھی ہیں۔ مثلاً جنس کی جبلّت ہے، بھوک کی جبلّت ہے، ایک دوسرے سے آگے نکلنے کا جذبہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو بنایا، اور اس کی مرکزی مخلوق انسان ہے جس کے بارے میں فرمایا کہ ہم نے اسے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالی چاہتے ہیں کہ انسان اس میں رہے بسے، زندگی اور اپنی نسل کو جاری رکھے تاکہ اللہ کی بندگی ہوتی رہے۔

زینت و شہوت

اب انسان کی اس دنیا میں بقا کے لیے ضروری تھا کہ وہ روٹی روزی کھاتا رہے تو اللہ نے بھوک کی جبلت انسان کے ساتھ لگا دی۔ نسلِ انسانی کے تسلسل کو شادی و نکاح ضروری تھا تو اللہ نے جنس کی جبلت انسان میں رکھ دی۔ تو یہ جبلتیں حیاتِ انسانی کے لیے ضروری تھیں، دوسری طرف یہ جبلتیں ہمارے لیے امتحان بھی بن گئیں، اس لیے کہ یہ خواہشات و شہوات، منھ زور ہیں۔ اپنی شدت کے وقت ہر طرح کے ضابطے کو توڑ کر اپنی تسکین و تکمیل چاہتی ہیں، اس طرح یہ انسان کو گمراہ کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ مِمَّا أَخْشَى عَلَيْكُمْ شَهَوَاتِ الْغَيِّ فِي بُطُونِكُمْ وَفُرُوجِكُمْ وَمُضِلَّاتِ الْهَوَى﴾ (مسند احمد) ”میں تمھارے بارے میں اندیشہ رکھتا ہوں، بطن و فرج کی سرکش شہوات اور گمراہ کن خواہشات کا“۔ اب انسان سے تقاضا یہ ہے کہ ان جبلتوں کو اپنی عقل و فطرت اور شریعت کے تابع رکھے تاکہ ان جبلتوں کا حیوان پنا، ہماری فطرت، ہمارے قلب اور ہمارے روحانی

وجود کو کہیں مغلوب نہ کر دے۔

شہوات کے ساتھ جو دوسرا تصور ہے وہ زینت کا ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ شہوت کو ریجھنے کے لیے کسی زینت کی ضرورت بھی ہوتی ہے، تو اللہ تعالی نے زمین کے اوپر بہت ساری چیزوں کو زینت بنا دیا ہے۔ سورۃ الکہف آیت ۷ میں اس زینت کا ذکر مجمل انداز میں اور سورۃ آل عمران آیت ۱۴ میں قدرے تفصیل سے اس کا ذکر کیا گیا۔

دورِ فتن کا مطلب

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ دور، دورِ فتن ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شر کی طرف لے جانے والے جو عناصر ہیں یا زندگی پر مؤثر ہونے والی جو قوتیں ہیں یا جو زینتیں ہیں، چاہے وہ سماج سے متعلق ہوں، چاہے وہ معاش سے متعلق ہوں، چاہے وہ سیاست سے متعلق ہوں۔ ان میں شر کی طرف لے جانے والے جو راستے ہیں وہ زیادہ کھل گئے ہیں۔ یعنی ان چیزوں میں، یا ان چیزوں کی زینت میں انسان کی شہوات کو لبھانے کی صلاحیت بڑھ گئی ہے۔ جس طرح ہمیشہ سے لوگوں میں شہوات موجود رہی ہیں اسی طرح دنیا کی زینت ہمیشہ سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی رہی ہے، لیکن موجودہ دور میں انسانوں نے دنیا کی چیزوں کی زینت میں ان کی کشش میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔

قربتِ عالمی

پہلے جب ہم یہ کہتے تھے کہ ایک مغرب ہے اور ایک مشرق ہے۔ ایک ویسٹ ہے اور ایک ایسٹ ہے، ایک عالمِ کفر ہے ایک عالمِ اسلام ہے اور جیسے ان کے درمیان کوئی لکیر کھنچی ہوئی ہے۔ نظر آنے والی کوئی لکیر چاہے موجود نہ ہوتی ہو لیکن پہلے فاصلے کی نہایت موٹی لکیر بہر حال موجود تھی۔ لیکن یہ جو جدید دور ہے۔ یہ جو سائبر ایج ہے اور انٹر نیٹ کا جو زمانہ ہے جس میں ہم رہتے ہیں اس میں Communication gap (مواصلاتی فاصلہ) خاصا کم ہو گیا ہے۔ انسانوں کی شہوتوں کو بھڑکانے والی جو چیزیں مغرب والوں نے اپنے لیے میسر کی ہیں، ان کے اخبار و آثار گویا اہلِ اسلام کو، اہلِ شرق کو بھی بغیر کسی زمانی و مکانی فصل کے میسر ہیں۔

شر کے اندر پھلنے پھولنے کی صلاحیت میں اضافے سے، یعنی شرق و غرب میں ان اسبابِ زینت و شہوت کی عام دستیابی سے اس دور میں ایک خاص طرح کا Human Character (انسانی کردار) وجود میں آیا ہے، یہ کردار اصل

میں تو مغرب میں پیدا ہوا ہے لیکن مواصلاتی فاصلے کے سمٹنے سے اس کردار کے اثرات ہم پر بھی ہیں۔ یہ جو خاص طرح کا انسان یا کردار ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے مغربی ہے لیکن اب نہ غربی رہا نہ شرقی بلکہ عالمی بن چکا ہے۔ تو اس عالمی کردار میں جو چیزیں مشترک ہیں ان میں سرفہرست سرکش انفرادیت ہے اور دوسری بے لگام لذت!

انفرادیت قدیم و جدید میں

بنیادی طور پر انسان اللہ تعالیٰ کی ایک منفرد مخلوق ہے، اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر بہت ورائٹی رکھی ہے۔ انسان کا اپنے بارے میں یہ احساس کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے خَلق کیا ہے ہمیشہ سے ہے۔ تو اپنے Unique Being (تخلیقِ منفرد) ہونے کا احساس اور تصورِ انفرادیت قدیم سے رہا ہے لیکن وہ قدیم تصور انفرادیت کچھ اور تھا اور دور جدید کی انفرادیت کچھ اور ہے۔

قدیم یا روایتی تصور انفرادیت کو سمجھنے کے لیے اگر آپ صوفیا کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو وہاں پر بھی ہمیں ایسا لگتا ہے کہ جیسے انسان کی انفرادیت کی پرداخت کی جاتی تھی، اس کو Grow کیا جاتا تھا، انسان کو Develop کیا جاتا تھا۔ لیکن اس انفرادیت اور امتیاز کا مدار ذات باری تعالیٰ تھی۔ وہ لوگ سمجھتے تھے ہم میں اپنی خصوصیت برقرار رکھنے کا جذبہ ہے تو ٹھیک ہے ہم خاص بنیں گے لیکن ﴿أَهْلُ الْقُرْآنِ هُمْ أَهْلُ اللهِ وَخَاصَّتُهُ﴾ (مسند احمد) ''قرآن والے ہی اہل اللہ اور اس کے خواص ہیں'' کے مصداق بن کر، اور اگر ہم میں مقرب بننے کا شوق ہے تو ہم تقرب الی اللہ میں ﴿أَيُّهُمْ أَقْرَبُ﴾ (الإسراء: 57) کا سماں باندھ کر ﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ﴾ (العلق:۱۹) کے مصداق عبادت میں لگیں گے اور اگر ہم میں آسائش پسندی اور اس کے لیے سبقت بازی کا جذبہ ہے تو ﴿وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ﴾ (المطففین:۲۶) کے مصداق ہم جنت کی نعمتیں پانے کی سعی کریں گے۔

رب کی رضا پانے کا یہ جو طرز عمل ہے اس کے لیے ہمارے صوفیا کے ہاں دو طرح کے الفاظ استعمال ہوتے تھے: ایک سُلوک کا اور ایک سَیر کا، سلوک یہ تھا کہ زندگی ایک سفر ہے اور ایک راستہ ہے، یہ دنیا منزل نہیں ہے، یہ کوئی ہمیشہ کا پڑاؤ نہیں ہے، قرآن مجید کی ابتدا ہی میں اس بات کو واضح کر دیا گیا اور ہر نماز میں اللہ

تعالیٰ نے ہمارے لیے مشروع کر دیا کہ ہم یہ دعا کیا کریں کہ ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ (الفاتحہ:٦) "کہ اے اللہ! تو ہمیں سیدھی راہ دکھا"۔ تو سلوک کے تصور کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اس راستے سے دل نہیں لگانا بلکہ اسے روندتے ہوئے، آگے بڑھنا ہے اور اس طرح بڑھنا ہے کہ اللہ کی طرف چلنے میں ہماری طبیعت میں کسل نہ ہو، طبیعت میں پژمُردگی نہ ہو، بلکہ نشاط، لگن اور جذبے کے ساتھ ہم اللہ کی طرف بڑھتے رہیں۔ دوسرا جو لفظ ہے وہ "سیر إلى الله" کا تھا۔ اللہ کی طرف پرواز کرنا اور تصور یہ تھا کہ انسان کو اللہ کی طرف لپکنا ہے، اللہ کی طرف پرواز کرنی ہے، تو ان چیزوں کے اندر بھی (Ambitions) اُمنگ و آرزو کا عنصر تھا کہ ہمیں اللہ کے راستوں پر چلنا ہے اور دوسروں سے آگے نکلنا ہے ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (البقرۃ:١٤٨) "ہمیں خیرات کے کاموں میں، بھلائی کے کاموں میں آگے نکلنا ہے" اور ہمیں اللہ کی طرف پرواز کرنی ہے، تو اس تصور میں اگرچہ دوسری چیزیں بھی ہیں آخرت بھی ہے جنت بھی ہے اس کی نعمتیں بھی ہیں۔ پھر اس میں ایک اپنی انفرادیت اور امتیاز بھی ہے کہ میں نے آگے چلنا ہے آگے بڑھنا ہے اور اونچا رتبہ پانا ہے لیکن ان تمام باتوں کا تعلق بہر حال ذات باری تعالیٰ سے ہے۔ ان تمام باتوں میں سے کوئی بات بھی بذاتہ مقصود نہیں ہے بلکہ جنت کو اس لیے پانا ہے کہ وہ رب کی رضا کا مقام ہے اور سب سے آگے اس لیے بڑھنا ہے کہ اپنے رب کے زیادہ نزدیک پہنچنے کا شوق ہے۔ تو انفرادیت کا یہ جو تصور ہے وہ خدا مرکز ہے۔

جدید انسان کے ہاں اب جو انفرادیت ہے وہ کسی بڑے مقصد کے تابع نہیں ہے۔ وہ خدا بنیاد نہیں ہے۔ وہ اپنی عظمت اور اپنی بڑائی میں اضافہ تو کرنا چاہتا ہے، اپنے آپ کو آگے لے جانا اور خود کو سب سے ممتاز ثابت کرنا تو چاہتا ہے لیکن خدا کی بندگی میں نہیں بلکہ انہی شہوات کی تسکین میں جن کا ذکر پہلے ہو چکا۔ یا پھر اپنے بھائی بندوں پر اپنی فضیلت جتانے کے لیے اور یہ احساسِ تفوّق بھی شہوات کی ایک قسم ہے۔ جدید انسان میں انفرادیت کا یہ جو وصف پیدا ہوا ہے یہ چونکہ خدا بنیاد نہیں ہے اس لیے سرکشی پر مبنی ہے۔ عہد جدید کا انسان ہر حال میں اپنی انفرادیت برقرار رکھنا چاہتا ہے، چاہے یہ انفرادیت ارتکاب حرام و منکر کے ذریعے ہو یا ترک فرض و معروف کے ذریعے۔ کوئی ضابطہ چاہے اخلاقی و قانونی ہو یا سماجی و دینی اس کی دھجیاں بکھیرنے

سے اگر انفرادیت کو سہارا ملتا ہے تو عہد جدید کے انسان کو اس سے کوئی باک نہیں، یہ ہے وہ صورتحال جس کی وجہ سے ہم کہہ رہے ہیں جدید انسان کا شوق انفرادیت سرکشی اور بغاوت پر مبنی ہے۔

لذت پسندی سے لذت پرستی تک

دوسری چیز جو اس عہدِ ستم گر کے انسانوں میں قدر مشترک کے طور پر عام ہے وہ لذتِ بے لگام ہے۔ انسانی جبلتوں پر کلام کے ضمن میں یہ بات گزر چکی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر لذت کا جذبہ اور اس کی طلب رکھی ہے۔ اسی کو ہمارے ہاں شہوت بھی کہتے ہیں۔ یہ انسانی جبلت کا حصہ ہے۔ جذبہ لذت اور اس کی کارفرمائیوں سے لطف اٹھانا ہمیشہ سے انسان کے ساتھ ہے۔ لیکن انسان، اپنی اس لذت پسندی پر کبھی فخر نہیں کرتا تھا اور نہ اسے اپنی کوئی خوبی سمجھتا تھا بلکہ "ایک ناگزیر ضرورت" کے طور پر اسے کسی قدر شرمندگی کے ساتھ بس "گوارا" ہی کرتا تھا۔ بلکہ ان لذتوں اور اس میں اپنے انہماک کے تذکرے کو بھی مروّت و شرافت اور حیا کے خلاف ہی سمجھتا تھا۔

اب دور حاضر میں یہ ہوا کہ شہوتوں اور لذتوں کو مقصود بنانا، ان سے لطف اندوزی کی منصوبہ بندی کرنا، ان لذتوں کے درپے ہونا، اس کو کوئی شرمندگی کی بات نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کو جیسے سمجھا جاتا ہے کہ انسان کو اس کی طلب کرنی چاہیے۔ اس سوچ سے متاثر انسانِ جدید سمجھتا ہے کہ اخلاق بھی بس لذتوں کی طلب و تکمیل میں آگے سے آگے بڑھنے ہی کا نام ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ لذت پسندی ہمیشہ سے انسانی جبلت کا حصہ رہی لیکن اس طرح کہ انسان کھل کر اس کے تذکرے کو بھی خلاف شرافت و مروت سمجھتا تھا۔ لیکن اس دور میں آکر لذت پسندی کو بڑھا دیا گیا۔ پہلے کیا تھا کہ بچپن کی ایک خاص عمر میں، انسان کے اندر کچھ لذت کے حصول کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور پھر یہ جوانی اور کچھ بعد تک چلتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ﴾ (الحدید:۲۰) "یاد رکھو! دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے، زیب و زینت ہے اور آپس میں فخر کرنا ہے اور مال اور اولاد میں کثرت کو طلب کرنا ہے"۔

اس آیت میں بیان شدہ مختلف چیزوں میں سے پہلی تین یعنی لعب و لہو اور زینت کا تعلق بعض اہل علم نے

انسانی زندگی کے پہلے دور سے بیان کیا ہے اور آخری تین کا تعلق ادھیڑ سے لے کر آخرِ عمر تک بیان کیا ہے۔ یعنی عمر کے ابتدائی دور میں انسان اپنی جبلتوں میں سے لہو ولعب و زینت کا کچھ زیادہ اسیر رہتا ہے۔ پھر جوں جوں بڑا ہوتا ہے تو اور طرح کی چیزیں سامنے آجاتی ہیں۔ اب انسان سہانے سپنوں کو تج کر زندگی کے تلخ حقائق کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور مال و اولاد اور خاص کر ان کے مستقبل وغیرہ کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ تو یہ ایک عام انسانی معاملہ تھا، لیکن جدید دور نے اس ترتیب کو تلپٹ کر دیا ہے۔ ٹیکنالوجی کے استعمال نے جہاں خارج کی زینت کو بڑھایا وہیں، مواصلات و اتصال نے انسان کی لذت پسندی کو بہت بڑھا کر لذت پرستی تک جا پہنچایا۔ اب زندگی میں وہ جو لذت کوشی اور لہو ولعب کا دور تھا وہ بہت پھیل گیا۔ اس کی ابتدا میں پہلے کی نسبت جلدی اور انتہا میں اتنی تاخیر ہونے لگی ہے کہ لگتا ہے کہ یہ دورِ لذت ختم ہی نہیں ہوتا۔ اس دور میں آکر لگتا ہے کہ یہ جو شہوت ہے یا یہ جو لذت کا حصول ہے وہ Grow کر گیا ہے۔ اس کا دورانیہ بہت لمبا ہو گیا ہے اور بہت پکی عمر تک جا کر بھی انسان کے اندر یہ جو لذت کی طلب ہے وہ جیسے کم نہیں ہو رہی بلکہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ یہ ہے جدید انسان کی ایک دوسری ''خصوصیت'' !

نرگسیت

دور جدید کی ایک اور برائی جو وبا کی طرح مغرب میں پھیل چکی ہے اور اس کا اثر ہمارے اوپر بھی آرہا ہے وہ Narcissism ہے جس کو نرگسیت بھی کہتے ہیں کہ انسان خود کو ہی اپنا محبوب بنا لے اور ہر آن اپنی محبت میں مبتلا رہے، ہر وقت اپنے آپ کو دیکھتا رہے اور اپنے بارے میں جیسے بہت اونچا گمان قائم کر لے۔ تو پرانے لوگوں کا ایسا معاملہ نہیں تھا۔ وہ اصحاب الفضائل تو ہوتے تھے لیکن ان کا اپنے بارے میں جو تصور (Self-Image) ہوتا تھا وہ ہمیشہ ان کے اصل کردار (Actual Self) سے کہیں کم ہوتا تھا۔ یعنی حقیقت میں جتنے بھی اور جیسے بھی ہوتے تھے، ہمیشہ اس سے بہت کم اپنے آپ کو دیکھتے تھے۔ اس کو ہمارے ہاں (Under Estimate) کرنا کہا جاتا ہے، تو وہ جیسے ان کی ایک عام عادت تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ان کو یہ وہم بھی نہیں ہوتا تھا کہ ہم اپنے اساتذہ اور بڑوں سے آگے نکل جائیں گے یا ہم ان سے بہتر ہو سکتے ہیں، چاہے عملاً وہ بہت آگے نکل بھی چکے ہوں اور باہر کی دنیا یہ مانتی بھی ہو کہ انھوں نے ائمہ کا مرتبہ پالیا ہے، اب

معاملہ اس کے برعکس ہے۔ نرگسیت یعنی اپنے بارے میں خوش گمانی رکھنا، اپنے حسن کا دیوانہ بنے پھرنا، اپنی خوبیوں اور خوبصورتیوں کو کھوجنا، ان پہ یقین رکھنا اور دوسروں کو ان کا یقین دلانا، اپنے شخصیتوں کی تعمیر و ترقی کے مینار قائم کر کے دوسروں کو دکھانا بہت عام ہو گیا ہے اور جدید ٹیکنالوجی نے ان ساری چیزوں کو بہت مہمیز دی ہے، نرگسیت کے لیے اس نے بہت سے ٹولز فراہم کر دیے۔ مختلف قسم کے میڈیا نے اپنی ذات اور اپنی صفات کی تشہیر و نمود کی بہت سی سہولیات فراہم کر دیں۔ ایک تو اس تشہیر ذات میں ایک خاص طرح کی لذت بھی ہے، دوسرے کاروبارِ دنیا، نوکری ملازمت اور سماجی تعلق و رتبے میں بھی جب اسے معاون پایا گیا تو گویا اسے ضروری سمجھ لیا گیا۔ انسان پوری طرح اپنی ذات کے سحر میں مبتلا ہو گیا اور اس طرح انفرادیت کا معاملہ بھی بڑھتا گیا۔

انفعالیت(Passivity)

جدید عہد کا ایک اور وصف (Passivity) انفعالیت ہے۔ مغرب کے بہت سے لوگوں نے اپنے تجزیے میں اسے بیان کیا ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ جدید آدمی بہت زیادہ(Active) متحرک ہے۔ بہت زیادہ سمجھتا ہے، بہت آزاد خیال اور اپنے فیصلوں میں آزاد ہے۔ جس طرح جدیدیت کی ابتدا میں عقل اور ذہن (Reason, Rationality) پر بہت زور دیا جاتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ گویا انسان جیسے بالکل انہی کا پابند ہے لیکن در حقیقت ایسا نہیں تھا۔ اسی طرح جدید عہد میں تحرک و تحریک، فعالیت اور کارگردگی (activity) پر خاصا زور دیا جاتا ہے لیکن عملی طور پر(Passivity) انفعالیت اور لاتعلقی غیر معمولی طور پر بڑھ چکی ہے۔ اور جس طرح روایتی لوگ تھے کہ وہ(Tradition Directive) تابعِ روایت تھے۔ یعنی روایت ان کو راہ دکھایا(Direct) کرتی تھی، ان کی لگام ان کے اپنے ہاتھ میں تھی نہ ہی عام عوام کے ہاتھ میں بلکہ ان کی لگام " روایت " کے ہاتھ میں تھی، وہ روایت جو کہ ان کے اسلاف سے اور ان کے پُرکھوں سے چلی آ رہی تھی۔ لیکن پھر ایک دور آیا جس میں انھوں نے روایت سے انحراف اور بغاوت کی اور لگے انفرادیت اور خود ارادیت کی باتیں کرنے، لیکن ان دعووں اور باتوں کے بعد بھی وہ نہ اپنے پابند ہیں اور نہ ہی دوسروں سے آزاد بلکہ زیادہ تر دوسروں ہی کے تابع ہیں، فرق کیا پڑا پہلے لوگ روایت کے پابند تھے اب "اِیجاد" کے پابند ہیں یعنی پہلے روایت انھیں ہدایت دے کر اپنا تابع بناتی تھی، اب ٹیکنالوجی اور جدید آلات انھیں سحر زدہ کر کے اپنے پیچھے چلاتے ہیں۔

اسی طرح کہنے کو آج کا انسان زیادہ متحرک وفعال (Active) ہے۔ اپنے احوال اور اپنے مسائل پر اس کی گہری نظر ہے۔ ہر طرف تحرک و تحریک، فعالیت اور کارگردگی (Activity) کا غلغلہ ہے لیکن انسان ہے کہ غیر فعال اور غیر متعلق (passive) ہوتا جارہا ہے۔ یہ بھی اصل میں جدید ٹیکنالوجی کا اثر ہے۔ اس دور میں خبر واخبار اور واقفیت عامہ کا سب سے بڑا ذریعہ (Medium) جو انسان کو بالکل غیر فعال اور بے حس ولا تعلق (Passive) بنادیتا ہے وہ ٹیلی ویژن (Television) ہے۔ ٹیلی ویژن کے بارے میں بہت سی ایسی تحقیقات سامنے آچکی ہیں کہ یہ جو آلہ (Medium) ہے یہ انسان کو منفعل (passive) بناتا ہے۔ اسے عکس کا دور یا تہذیب (Image Culture) بھی کہتے ہیں۔ متحرک اور غیر متحرک تصویر (movie and picture) کا جو سارا حاصل ہے وہ انفعالیت ہے۔ جب انسان کتاب پڑھ رہا ہوتا ہے تو وہ بیدار و فعال (Active) ہوتا ہے۔ (Culture) کلچر، اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے وہ لکھتا ہے، تفکر کرتا ہے، سوچ وبچار کرتا ہے پھر آگے چلتا ہے، جبکہ اسکرین کے سامنے انسان بالکل passive ہوجاتا ہے اور کچھ چیزیں جس انداز سے اس پر (Imparted) ظاہر ہوتی ہیں تو اس کے لیے تفکیر وغیرہ کا موقع نہیں ہوتا، نہ صرف یہ بلکہ انسان؛ سکرین میں کھب کر ماحول حتیٰ کہ اپنی ذات تک سے لاتعلق ہوجاتا ہے۔ اس سارے عمل سے انسانوں میں جو کیفیت پیدا ہورہی ہے، وہ (Passivity) انفعالیت ہے۔

ایک نئی سماجی اساس

ایک علمی بحث ہے کہ سماج یا کلچر کی بنیاد کیا ہے۔ Sorokin ایک مشہور Sociologist (ماہر عُمرانیات) تھا، اس نے کہا کہ Culture (سماج) دو طرح کے ہوتے ہیں: پہلا Ideational culture۔ یہ وہ کلچر ہوتا ہے جو اپنی بنیاد Ideas (نظریات) پر رکھتا ہے، جو افکار کی بنیاد پر کھڑا ہے اور دوسرا ہے Sensate Culture، یہ کلچر انسان کے حواس کو اپیل کرتا ہے، اس کی بنیاد محسوسات پر ہوتی ہے۔ اس دنیا میں جتنے بھی بڑے (Ideas) نظریات ہوتے ہیں وہ سب (Meta Physical) ماوراء الطبیعاتی ہوتے ہیں، اس لیے ہمیشہ سے Ideational culture کی بنیاد Meta Physical معاملات ونظریات پر رہی ہے۔ اس کے برعکس جو Sensate Culture ہوتا ہے اس کا مدار اور اس کی بنیاد Physical (مادّی) چیزوں پر ہوتی ہے۔ اس سے ایک سطحیت اور ظاہریت سی پیدا ہوجاتی ہے۔ Sorokin نے

مغرب کے بارے میں کہا تھا کہ وہ Sensate Culture کے فیز میں داخل ہوگیا ہے اور اس میں حواس کی اہمیت بنیادی ہے اور حواس کے ذریعے چیزوں کو دیکھنا جبکہ چیزوں کے ساتھ کوئی نظریاتی تعلق انسان کا نہ ہو۔ جیسا ہم نے عرض کیا کہ اس سے سطحیت پیدا ہوئی، انسان حقیقت سے دور ہوئے اس سے چیزوں کے ساتھ ایک کھوکھلا تعلق وجود میں آیا، جو دیکھنے میں تعلق ہے لیکن حقیقت سے دور ایک کھوکھلا تعلق !!

مشغولیت بے کار

پیچھے جو Passivity کی بات چلی تھی تو وہ اس بات سے جڑی ہوئی ہے کہ مندرجہ بالا سماجی تبدیلی سے جس طرح سے چیزوں کے ساتھ کھوکھلا تعلق وجود میں آیا۔ اسی طرح کاموں کے ساتھ بھی ایک کھوکھلا تعلق وجود میں آیا۔ یہ بھی Passivity ہی کی ایک قسم ہے یعنی ایک Passivity تو وہ ہے جو کام اور حرکت سے گریز کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، اور ایک Passivity وہ ہے جو حقیقی کام سے گریز کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ تو اسی کھوکھلے پن کا نتیجہ ہے کہ بلاوجہ کی مشغولیت (Busyness) پیدا ہوئی، تیزی اور حرکت بہت لیکن منزل کی جانب پیش رفت دو گام بھی نہیں۔

منیؔر اس مُلک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے　　　کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

تو بے کار کی مصروفیت اور اس پہ تاثر ایسا کہ جیسے مصروف رہنا بجائے خود ایک اہم قدر ہے۔ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ آپ مصروف کس میں ہیں، میٹافزکس نظریات سے اپنا ناطہ تو پہلے کاٹ دیا اب حقیت اور حقیقت الحقائق کے ساتھ مشغول رہنے کا کیا امکان اور کیا اہمیت بچی ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ تو آج کل کی چلت پھرت کی مصروفیتِ بیکار کو اشتغال بالادنیٰ، آسانی سے قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر آج کوئی آدمی کم وقت کام کرے، زیادہ کمائی نہ کرے، اپنے بیوی بچوں کو وقت دے، اپنے دین و مذہب کو وقت دے اور کچھ ان کی خدمت کرے، تو اس کو دنیاوی تو خیر ہے ہی مذہبی اعتبار سے بھی کم تر سمجھا جاتا ہے کہ یہ آدمی تو نالائق ہے، دنیا میں آگے بڑھ نہیں سکا اور اس کے لیے وہ اس طرح کے بہانے تلاش کرتا ہے۔ تو کام کو غیر معمولی اہمیت دینا، زندگی میں یعنی معاش کو، اس کی بھاگ دوڑ اور مصروفیت کو بجائے خود ایک قدر بنا لینا یہ بھی Passivity کی ایک قسم اور ظاہر بین سماج کا سرمایہ ہے۔

آج سے ساٹھ ستر سال پہلے کا انسان اتنا مصروف نہیں ہوتا تھا جتنے لوگ اب مصروف ہوتے ہیں، اور خاص

طور پر جو Industrial Age ہے اور اس کے بعد پھر اب Information Technology کا Cyber Age شروع ہو گیا ہے تو Passivity کی یہ قسم بہت بڑھ گئی ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ خاص طور پر کمپیوٹر سائنس یا پروگرامنگ یا ان فیلڈز سے جو لوگ متعلق ہوتے ہیں، وہ بہت زیادہ Occupied ہوتے ہیں اپنے کام میں، جبکہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان کا وقت، اس کی توجہ اور اس کی کشش کا جو Main Object ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہونا چاہیے یا آخرت کو ہونا چاہیے، لیکن اب معاش کی ایسی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں جو انسانوں کے لیے بہت زیادہ Over weldment ہیں بہت Occupier ہیں اور خاص طور پر وہ لوگ جو IT وغیرہ سے متعلق ہیں ان کو اس کا تجربہ ہے کہ ان کے لیے عبادات کرنا یا اللہ سے متعلق رہنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے، یعنی اتنا زیادہ وہ اس ماحول کے اندر رہتے ہیں کہ اگر وہ نماز کے اندر بھی ہیں تو اس وقت بھی ان کا ذہن انہی چیزوں میں چل رہا ہوتا ہے، تو یہ جو ایک خاص طرح کی مصروفیت اور مشغولیت ہے جس نے لوگوں کو ذاتِ حق سے مشغول کر کے ان کی اصل منزل سے دور کر دیا ہے۔

دروں بینی سے گریز

دور جدید کی ایک بڑی برائی جو مذکورہ بالا سب چیزوں خصوصاً "خدا بینی" سے گریز کا نتیجہ ہے کہ انسان کے باطن میں جیسے ایک خلا سا بن گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے ایک فرمان میں ﴿غِنَى النَّفْسِ﴾ (صحیح مسلم) کے الفاظ آتے ہیں تو غِنَی النَّفْسِ کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ انسان کا نفس غنی ہو، مخلوقات سے مستغنی ہو اور ایک مطلب علماء نے یہ لکھا ہے کہ اس کا نفس باثروت ہو یعنی نفس کے اندر فضائل موجود ہوں تو وہ نفس گویا امیر نفس ہے جس کے اندر توکل، تواضع، اِخبات، صبر اور شکر ہے تو گویا یہ ایک باثروت نفس ہے۔ لیکن وہی بات کہ دنیا کی کشش اتنی بڑھا دی گئی ہے، اس میں اتنی رنگارنگی ڈال دی گئی ہے اور حواس سے دیکھی جانے والی چیزوں کو باطنی یا غیر مرئی حقائق پر اتنا زیادہ بڑھاوا دیا گیا ہے کہ ایک تو انسان اب اپنے اندر جھانکتا نہیں ہے، اپنے اندر غور نہیں کرتا اور اگر جھانک بھی لے تو اس کے لیے وحشت کا سامان زیادہ ہے اس لیے کہ باطن تو نیکی اور فضائل سے مزین ہی نہیں ہے اور اس وجہ سے پھر وہ خود بینی سے گریز کرتا ہے۔ خارج کی دنیا اتنی خوبصورت بنادی گئی ہے اتنی پرکشش بنادی گئی ہے کہ جب انسان اپنے اندر جھانکتا ہے تو اس کو خلا محسوس ہوتا ہے لگتا ہے اندر کچھ ہے ہی نہیں، تو اس وجہ سے پھر وہ گویا اپنے اندر جھانکنے سے ہی پرہیز کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ بہت خوفناک ہے کہ دروں بینی اور

احتساب نفس کی کمی سے، ان برائیوں کی اصلاح کی طرف توجہ بھی نہیں ہوتی جن کا ذکر پہلے ہو چکا۔ تو یہ کچھ مسائل ہیں جو اس دور میں ایک جدید آدمی کو درپیش ہیں اور ہم میں سے ہر ایک ان چیزوں کا، کسی نہ کسی درجے میں گزیدہ اور سے متاثر ہے۔

بچاؤ کا راستہ

یہ تو تھا دورِ جدید کی چند برائیوں اور بیماریوں کا تذکرہ، اب ان سے بچاؤ اور ان کے معالجے کی طرف آتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک حدیث ہماری رہنمائی کرتی ہے اگرچہ اس میں کچھ تفصیل بھی ہے جو ہم آگے ذکر کریں گے لیکن بنیادی ہدایات اور دورِ جدید کے فتنوں کے آگے بند باندھنے کے اسباب اس حدیث میں موجود ہیں۔ سنن ترمذی میں ہے کہ ایک موقعے پر نبی اکرم ﷺ نے جب فتنوں کا ذکر کیا تو آپ سے سوال کیا گیا کہ ﴿مَا النَّجَاةُ﴾ ”نجات کیا ہے؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿أَمْسِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ﴾ ”اپنی زبان کو تھام کر رکھو، روک کر رکھو اور تمھارا گھر تمھیں کافی ہو جائے“۔ اسی کو ایک اور حدیث میں کہا گیا ہے ﴿كُونُوا أَحْلَاسَ بُيُوتِكُمْ﴾ (ابو داود) ”اپنے گھروں کے ٹاٹ بن جاؤ، یعنی اپنے گھروں میں ہی رہا کرو“۔ اور تیسری بات آپ نے فرمائی ﴿وَابْكِ عَلَى خَطِيئَتِكَ﴾ ”اور اپنی خطاؤں پر رویا کرو“۔

اس حدیث کا موضوع عزلت و خلوت ہے۔ ہمارے اکابر میں اس پر بحث رہی ہے کہ انسان کے لیے بہتر اور افضل کیا ہے، کیا عزلت نشینی، خلوت اختیار کرنا، تنہائی اختیار کرنا، لوگوں سے علیحدگی اختیار کرنا کیا یہ رویہ بہتر ہے، یا لوگوں میں گھل مل کر رہنا، لوگوں کے ساتھ اختلاط رکھنا یہ بہتر ہے۔ امام غزالی علیہ الرحمہ نے ”احیاء علوم الدین“ میں ایک باب الگ سے قائم کیا ہے کہ عزلت اور اختلاط میں سے کیا چیز بہتر ہے، اور انھوں نے دونوں مؤقف اور ان کے دلائل نقل کیے ہیں اور پھر عزلت اختلاط کے آداب اور فوائد و فضائل بیان کیے ہیں۔ ہم اس بحث کے اہم نکات کو یہاں پیش کرتے ہیں:

اصل اختلاط ہے

انسانوں کے ساتھ ملنے جلنے یا الگ تھلگ رہنے کے اعتبار سے جو اصل طریقہ ہے وہ اختلاط یعنی لوگوں میں گھل مل کر رہنا ہے۔ یہی اصل اور عام طریقہ ہے، عام حالات اور نارمل صورتِ حال میں اختلاط کے اصول پر ہی عمل کیا

جائے گا۔آپ ﷺ نے فرمایا﴿الْمُؤْمِنُ الَّذِی يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلَی أَذَاهُمْ أَعْظَمُ أَجْرًا مِنَ الْمُؤْمِنِ الَّذِی لاَ يُخَالِطُ النَّاسَ وَلاَ يَصْبِرُ عَلَی أَذَاهُمْ﴾(سنن ترمذی)"ایسا مؤمن جو لوگوں میں گھلا ملا رہتا ہے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرتا ہے، وہ اس مؤمن سے کہیں بہتر ہے جو لوگوں میں گھلتا ملتا نہیں ہے اور ان کی اذیتوں پر صبر نہیں کرتا"۔امام نووی علیہ الرحمہ نے "ریاض الصالحین" میں اس موضوع پر خوبصورت استدلال قائم فرمایا ہے۔پہلے انھوں نے گوشہ نشینی کا ذکر کیا اور یہ قرار دیا کہ یہ دائمی اور عمومی حکم نہیں ہے بلکہ گوشہ نشینی کا حکم اور اس کی فضیلت خصوصی حالات میں ہے:باب استحباب العزلة عند فساد الناس والزمان أو الخوف من فتنة في الدين ووقوع في حرام وشبهات ونحوها"لوگوں یا زمانے کے فساد کے وقت، یا دین میں فتنے کے شکار ہونے کے خوف یا حرام و مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہو جانے کے اندیشے کے تحت، گوشہ نشینی کی فضیلت کا بیان"۔امام صاحب کی اس تقریر سے بالکل ظاہر ہے کہ عزلت کا پسندیدہ ہونا عمومی نہیں ہے بلکہ فتنے کے اندیشے کے تحت مخصوص حالات میں ہے۔اس کے بعد آپ نے کچھ روایات نقل کیں، اور اس کے بعد پھر ایک بہت طویل "ترجمۃ الباب" قائم کیا ہے: باب فضل الاختلاط بالناس وحضور جُمَعِهم وجماعاتهم، ومشاهد الخير، ومجالس الذكر معهم"لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے، جمعہ، جماعت، نیکی کے مواقع اور مجالس ذکر وغیرہ میں حاضر ہونے کی فضیلت کا بیان"۔اس استدلال کے بعد انھوں نے الفاظ میں بتایا کہ اصل یہی ہے، نبی اکرم ﷺ کی سنت بھی یہی ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خلفاے راشدین کا اسوہ بھی یہی ہے، ہمارے ائمۂ کرام علیہم الرحمہ کا طریقہ بھی یہی ہے کہ لوگوں میں گھل مِل کے رہا جائے اور جمعہ و جماعت اور ان کی اعیاد اور ان کے سارے معاملات میں شرکت کی جائے۔

اختلاط کے آداب و فوائد

حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ نے اختلاط کے کچھ فوائد بتائے ہیں، ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہم معاشرے کا حصہ ہیں، لوگوں میں گھل مل کر رہتے ہیں تو کیا یہ فوائد اٹھا بھی رہے ہیں کہ نہیں۔کچھ صفات جوڑوں کی شکل میں بیان کی ہیں۔پہلا فائدہ انھوں نے کہا ہے "التعليم والتعلم" لوگوں میں گھلے ملے رہنے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان ان سے

سیکھتا اور ان کو سکھاتا ہے، جب انسان لوگوں میں رہے گا تو اس کے لیے اس کا موقع ہوگا کہ وہ لوگوں سے سیکھے گا بھی اور اگر وہ کچھ علم رکھتا ہے، کچھ جانتا ہے تو دوسروں کو سکھائے گا بھی، اور یہ دونوں چیزیں انسان کے واسطے اس کی آخرت کے لیے بہت مفید اور فائدہ مند ہیں۔ پھر انھوں نے دوسری چیز بتائی ہے "التأديب وَالتَّأَدُّب"، پہلی دو چیزوں "التعليم والتعلم" کا تعلق علم سے تھا اور ان دو چیزوں "التأديب وَالتَّأَدُّب" کا تعلق ادب سے ہے۔ علم اور ادب، یہ ترکیب ہمارے اکابرین کے ہاں بہت بیان کی جاتی تھی، ہمارے ہاں "تعلیم و تربیت" مستعمل ہے، تعلیم کا تعلق علم اور معلومات سے ہے جب کہ تادیب کا تعلق ادب، عمل اور معمولات سے ہے۔ تعلیم کا زیادہ تر تعلق جاننے سے ہے، جبکہ تادیب کا زیادہ تر تعلق سیکھنے سے ہے۔ گویا نیکی کی باتوں کی واقفیت اور علمیت حاصل کرنا اور ان کو جاننا تعلیم ہے اور انہی باتوں میں عملیت پیدا کرنا، ان کو سیکھنا اور انھیں اپنی سیرت و کردار میں داخل کرنا ادب یا تادیب ہے۔ تادیب کا مطلب دوسروں کو ادب سکھانا، ان کی تربیت کرنا اور ان کی سیرت و کردار کی تعمیر کرنا، جبکہ تادّب کا مطلب ہے دوسروں سے ادب و آداب سیکھنا، تربیت حاصل کرنا اور ان کی سیرت و کردار کی روشنی میں اپنی سیرت و کردار کی تعمیر کرنا۔

تعلیم و تعلم کے ساتھ، ادب و آداب سیکھنا بھی ضروری ہیں، اور آداب زیادہ تر صحبت سے حاصل ہوتے ہیں، تادیب میں یہ نہیں ہوتا کہ تلقین بہت زیادہ ہو، دراصل لوگوں کی صحبت سے، لوگوں کو دیکھ کر انسان ادب حاصل کرتا ہے۔ عربی میں کہتے ہیں: "الطبع السليم سراق" کہ طبع سلیم بھی چور ہوتی ہے یعنی انسان دوسرے سے تاثر قبول کرتا ہے دوسرے سے چیزیں لیتا ہے، اس طرح کی بہت سی باتیں ہمارے اکابرین کے ہاں ملتی ہیں کہ ہم بہت زیادہ علم کی نسبت تھوڑے سے ادب کے زیادہ محتاج ہیں، یا یہ کہ ہم اپنے اساتذہ کے پاس جاتے تھے، ان کے پاس بیٹھتے تھے اور ہم ان کے علم سے زیادہ ان کے ادب سے فائدہ حاصل کرتے تھے۔ تو لوگوں میں گھلنے ملنے کا دوسرا فائدہ التأديب وَالتَّأَدُّب ہے۔ جب ہم لوگوں میں گھل مل کر رہ رہے ہوں تو ہم یہ کوشش کریں کہ اگر ہماری کوئی اچھی تربیت ہوئی ہے اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے کچھ اخلاقی محاسن عطا کیے ہیں، تو ہم دوسروں کی تادیب کا ذریعہ بنیں، دوسروں کو سکھانے کی کوشش کریں۔ اور جو خود سے بہتر اخلاق اور کردار والے لوگ ہیں تو ان سے سیکھنے اور تربیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ تو یہ دو طرفہ معاملہ ہوتا رہے۔ لوگوں میں رہ کر ہمارا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ لوگوں کو سکھائیں اور ان سے سیکھیں۔

تیسری چیز جو انھوں نے بتائی ہے وہ ہے ”الاستئناس والإيناس“ لوگوں سے اُنس رکھنا اور لوگوں سے اُنس پانا، دیکھیں ہم انسان ہیں اور لفظِ انسان کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ یہ نسیان سے ہے لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ لفظ انسان ”اُنس“ سے ہے، تو گویا انسان کو اللہ تعالیٰ نے اُنس کے مادے سے خَلق کیا یعنی انسان انس پسند ہے۔ ایک معروف روایت ہے: ﴿الْمُؤْمِنُ مَأْلَفٌ، وَلَا خَيْرَ فِيمَنْ لَا يَأْلَفُ، وَلَا يُؤْلَفُ﴾ (مسند احمد) ”مؤمن سراپا الفت ہوتا ہے اور اس مؤمن میں کوئی خیر نہیں ہے جو دوسروں سے الفت نہیں رکھتا، اور اس سے الفت نہیں رکھی جاتی“۔ استیناس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان سے اُنس حاصل کرنا، اور ایناس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اُنس فراہم کرنا، تو یہ تبھی ہو گا جب انسان لوگوں میں گھلا مِلا رہے گا ان سے میل جول اور اختلاط کرے گا تب ہی موقع ہو گا ورنہ توانس کا کوئی موقع ہی نہ ہو گا۔ اہل ایمان کا ایک دوسرے سے محبت رکھنا، ایک دینی ضرورت اور دینی ذمے داری ہے۔ مشہور روایت ہے: ﴿لا تدخُلُوا الجنَّةَ حتى تُؤمِنُوا ولا تُؤمِنوا حتى تحابُّوا، أفلا أدلُّكُم على أمرٍ إذا فعلتُمُوهُ تحاببتُم أفشُوا السَّلام بينكُم﴾ (ابوداود) ”تم جنت میں داخل نہیں ہوسکتے جب تک ایمان والے نہ بنو اور تم مؤمن نہیں ہوسکتے جب تک کہ تم ایک دوسرے سے محبت نہ کرو، کیا میں تمھاری رہنمائی نہ کروں ایک ایسے کام کی طرف کہ اگر تم وہ کام کرلو تو تمھاری آپس میں محبت پیدا ہوجائے گی، (وہ کام یہ ہے کہ) آپس میں سلام کو عام کرو۔ تو اہلِ ایمان کی محبت پانا ایک فضیلت بھی ہے اور ایک ضرورت بھی، اللہ کے نبی اکرم ﷺ سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ کوئی ایسا عمل بتادیں کہ میں اللہ کا بھی محبوب بن جاؤں اور لوگوں کا بھی محبوب بن جاؤں! ﴿أَحَبَّنِي اللهُ وَأَحَبَّنِي النَّاسُ﴾ (ابن ماجہ) ” تو آپ نے یہ نہیں کہا کہ یہ تمھارا مؤقف غلط ہے کہ تم لوگوں کے محبوب بننا چاہتے ہوں، لوگوں کا محبوب بننا انسان کے اندر یہ جذبہ رکھا گیا ہے، اور صالحین کا محبوب ہونا گویا اللہ تعالیٰ کے محبوب ہونے کی علامت ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ اللهَ إِذَا أَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرِيلَ فَقَالَ: إِنِّي أُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبَّهُ، قَالَ: فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ، ثُمَّ يُنَادِي فِي السَّمَاءِ فَيَقُولُ: إِنَّ اللهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبُّوهُ، فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ، قَالَ ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ الْقَبُولُ فِي الْأَرْضِ﴾ (صحیح

مسلم) "جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام کو بلا کر فرماتے ہیں کہ فلاں بندے سے میں محبت کرتا ہوں، آپ بھی اس سے محبت کریں تو جبریل اس سے محبت کرتے ہیں، پھر فرشتوں میں اعلان کرتے ہیں کہ فلاں بندے سے اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں تم بھی اس سے محبت کرو، تو آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اس کے بعد زمین والوں میں اس کی قبولیت رکھ دی جاتی ہے"۔

ایک اور چیز جو امام صاحب علیہ الرحمہ نے بیان کی ہے وہ ہے "نیل الثواب وإنالته" لوگوں کے ذریعے ثواب حاصل کرنا اور لوگوں کو ثواب پہنچانا، لوگوں کے ذریعے ثواب حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی خدمت کرنا، کوئی بیمار ہے تو اس کی عیادت کے لیے جانا، کوئی فوت ہو گیا ہے تو اس کے جنازے پر جانا، کوئی تکلیف میں ہے تو اس کی مدد کرنا۔ اس میں ہم اجر بھی پا رہے ہوتے ہیں اور اجر پہنچا بھی رہے ہوتے ہیں، لوگوں کو اجر دینے کا، نیکی کا ذریعہ بھی بنتے ہیں، اگر ہم بیمار ہیں تو گویا لوگوں کے لیے ایک موقع ہے کہ وہ ہماری عیادت کے لیے آئیں، ہم اگر کسی کو دعوت پر بلا رہے ہیں تو ان کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کریں۔

اور پھر امام صاحب نے ایک اور بات جو اس میں بتائی ہے وہ ہے "التَّوَاضُعُ" یعنی مخالطت سے انسان کے اندر تواضع پیدا ہوتی ہے۔ امام صاحب نے تفصیل سے لکھا ہے کہ اگر علم کے بغیر ہی انسان خلوت اختیار کر لے تو وہ نِکارت ہے جو انسان کو خراب کرتی ہے اور کہا کہ جو آدمی علم جانتا ہے اور جس کے اندر اچھے احساس ہیں اس کے لیے خلوت مفید ہے، یعنی وہ قرآن سے تعلق رکھے گا، علمِ دین سے تعلق رکھے گا، لیکن ایک آدمی اگر جاہل ہے تو اس کے لیے خلوت مضر ثابت ہو سکتی ہے اور پھر اس کے اندر ایک تکبر بھی پیدا ہو جاتا ہے، اسی لیے بہت سے اکابرین سے منقول ہے کہ خلوت کی اصل نیت یہ ہو کہ میں لوگوں کو اپنے شر سے بچا رہا ہوں۔ بہرحال جب انسان لوگوں میں گھل مِل کر رہتا ہے تو اس سے انسان کے اندر تواضع پیدا ہوتی ہے، انسان کے اندر انکسار پیدا ہوتا ہے، اور پھر انسان دوسروں کے لیے ایثار کرتا ہے، وقت کا بھی ایثار کرتا ہے، مال کا بھی ایثار کرتا ہے اور بہت سی چیزوں کا معاملہ کرتا ہے۔

امام صاحب نے اختلاط کا ایک فائدہ "التَّجَارُب" بیان کیا ہے کہ انسان لوگوں سے معاملہ کرتا ہے تو تجربہ حاصل کرتا ہے۔ بعض ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جو محض نظریاتی طور پر انسان نہیں سیکھ سکتا جب تک ان کا مشاہدہ اور

پھر عملی تجربہ نہ ہو، تو جب انسان لوگوں میں رہے گا تو بہت سی ایسی چیزوں کو حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ ایک فائدہ امام صاحب نے ”النفع و الإنتفاع“ بھی بیان کیا ہے یعنی دوسروں کے لیے فائدہ مند بننا اور ان سے فائدہ اٹھانا۔

ہم لوگوں میں گھل مل کر رہتے ہی ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم امام صاحب علیہ الرحمہ کی بیان کردہ چیزوں کو مستحضر رکھیں، ان کو مقصود بنائیں اور انھیں اختیار کرنے کی نیت کریں، تو ہمارا لوگوں میں رہنا بسنا ہمارے لیے بھی زیادہ Productive ہو جائے گا، دوسروں کے لیے بھی زیادہ مفید ہو جائے گا۔

عزلت و خلوت، کچھ اصولی باتیں

ہم نے اوپر اختلاط کے فوائد جان لیے اور ہمارا یہ ارادہ بھی ہے کہ انہی فوائد و فضائل کو مقصود بنا کر لوگوں سے میل جول رکھا کریں گے۔ لیکن کیا اس کے بعد خلوت و عزلت کی کوئی ضرورت رہتی ہے کہ نہیں ؟ تو جاننا چاہیے کہ ضرور رہتی ہے۔ اگر حالات بالکل نارمل بھی ہوں تب بھی انسان ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہ سکتا ہے۔ لیکن حالات بدلتے بھی رہتے ہیں کبھی داخلی حالات بدلتے ہیں اور کبھی خارجی، دونوں طرح کی تبدیلیاں یہ تقاضا کرتی ہیں کہ انسان بھی اپنے عام اور اصل حال، جلوت و اختلاط کو تبدیل کرے اور خلوت و عزلت کا سہارا لے۔ تو اب ہم انہی دو یعنی خلوت و عزلت کی کچھ بات کرتے ہیں۔

عزلت اور خلوت میں فرق

عزلت اور خلوت کبھی ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، کبھی ان میں فرق بھی کیا جاتا ہے۔ خلوت عارضی بھی ہو سکتی ہے اور کچھ وقت کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ محدود معنوں میں ہو سکتی ہے، یعنی انسان کچھ لوگوں یا کچھ کاموں سے الگ ہو جائے۔ اور عزلت مستقل یا ایک لمبے عرصے کے لیے ہوتی ہے۔ عزلت یہ ہے کہ انسان اپنا لائف اسٹائل ہی ایسا بنا لے کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ ہو جائے۔ اگر ہم عزلت و خلوت کے اصول کا عملی اطلاق جاننا چاہیں تو اس کے لیے تین طرح کے حالات ہو سکتے ہیں:

حالتِ امن اور عزتِ اسلام: یعنی امن کے حالات ہوں اور معاشرے اور ریاست میں دین قائم ہو۔

حالتِ فتن: جب فتنہ و فساد اتنا بڑھ جائے کہ انسان کا خود حق پر قائم رہنا مشکل اور گناہ میں پڑنے کا اندیشہ شدید ہو جائے۔

حالتِ امن اور غربتِ اسلام: معاشرے اور ریاست کی سطح پر اسلام اجنبی ہو جائے، لوگوں میں خرابی پھیل جائے لیکن دعوت و تبلیغ اور اصلاح کی گنجائش موجود ہو۔

حالتِ امن اور عزتِ اسلام

اگر ہم اپنے اکابرین کو دیکھیں تو ہمیں لگتا ہے کہ کچھ لوگوں نے جیسے یہ رویہ بھی اختیار کیا کہ مستقلاً ہی لوگوں سے علیحدگی اختیار کر لی اور بالکل ابتدائی دور میں ہمیں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ شاید وہ کوئی آئیڈیل رویہ نہ ہو، لیکن جو انھوں نے اس وقت کیا اس کے بارے میں بھی ایسا لگتا ہے کہ ان کو کچھ Privilege حاصل تھی جو ہمیں حاصل نہیں ہے، ایک تو یہ ہے کہ سماج خیر پر مبنی تھا اور جو نظمِ امت تھا وہ بھی خیر پر تھا، اور ایسے حالات میں انسانوں کے لیے موقع ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذوق کے مطابق جس چیز کو چاہیں اختیار کر سکیں، کچھ لوگوں کے اندر تبتل کا ذوق بڑھا ہوا ہوتا ہے تو وہ اس کو Afford کر لیتے تھے۔ سلف کے واقعاتِ عزلت کو اسی پر محمول کرنا چاہیے۔

حالتِ فتن اور عزلت

جب برائی کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ لوگوں کو روکتے روکتے خود متاثر ہو جانے کا اندیشہ پایا جائے تب عزلت یعنی مکمل علیحدگی جائز ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ائْتَمِرُوا بِالمَعْرُوفِ وَتَنَاهَوْا عَنِ المُنْكَرِ، حَتَّى إِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُطَاعًا، وَهَوًى مُتَّبَعًا، وَدُنْيَا مُؤْثَرَةً، وَإِعْجَابَ كُلِّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيِهِ، فَعَلَيْكَ بِخَاصَّةِ نَفْسِكَ وَدَعِ العَوَامَّ، فَإِنَّ مِنْ وَرَائِكُمْ أَيَّامًا الصَّبْرُ فِيهِنَّ مِثْلُ القَبْضِ عَلَى الجَمْرِ﴾ (سنن ترمذی) ”نیکی کا حکم کرو اور برائی سے روکو، یہاں تک کہ تم دیکھو کہ لالچ کو اپنا مطاع بنا لیا گیا ہے، اور خواہشات کی پیروی عام ہو جائے، اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جانے لگے اور ہر بندہ اپنی ہی رائے کے گھمنڈ میں مبتلا ہو، تو عوام کی فکر چھوڑ کر اپنی ذات کی فکر کرو، کیونکہ ایسے دن آنے والے ہیں جن میں صبر کرنا ایسا مشکل ہو گا جیسے انگارا ہاتھ میں لینا“۔

”ایام صبر“ اصل میں اشارہ ہے عزلت اور گوشہ نشینی کی طرف اس لیے کہ صبر خلاف نفس چیزوں پہ خود کو روکے رکھنے کو کہتے ہیں چونکہ ان برے حالات میں اختلاط و معاشرت کو ترک کر کے عزلت اختیار کرنا ہو گی اور اس ترک و اختیار میں لامحالہ شدید قسم کا صبر کرنا پڑے گا۔ (مستفاد من مرقاة المفاتيح) تو ایسے دور میں جب فتنے عروج پہ

ہوں اور انسان کو اپنے دین وایمان کا خطرہ محسوس ہونے لگے تو دین وایمان کو بچانے کے لیے گوشہ نشینی اور عزلت اختیار کرنا جائز ہے۔ ایک بار نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ﴿يُوشِكُ أَنْ يَكُونَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ يَتْبَعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ، يَفِرُّ بِدِينِهِ مِنَ الْفِتَنِ﴾ (صحیح بخاری) ''قریب ہے (کہ وہ دن آجائیں) کہ مسلمان کا بہترین مال بکریاں ہوں جن کے پیچھے وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور وادیوں میں گھوما کرے اپنے دین کو فتنے سے بچانے کے لیے''۔ علیحدگی کے بیان کے لیے پہاڑوں کی چوٹیوں اور وادیوں کا ذکر، ان حالاتِ فتن میں لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کی فضیلت پر مبالغہ کی طرف اشارہ ہے۔ (مستفاد من مرقاۃ المفاتیح) فتنے کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا باہم شدید اختلاف پایا جائے اور نوبت جنگ وجدل تک جا پہنچے۔ حق مشتبہ ہوجائے اور واضح نہ ہو پا رہا ہو کہ حق کس گروہ کے ساتھ ہے۔ تو جس پر حق واضح نہ ہو بلکہ مشتبہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ تمام گروہوں اور لوگوں سے الگ ہو جائے اس طرح کی مثالیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ملتی ہیں کہ مشاجرات کے دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا یہ خیال تھا کہ حق مشتبہ ہوگیا ہے اور معلوم نہیں ہو رہا ناحق کون ہے اور برحق کون ہے، تو انھوں نے علیحدگی اختیار کرلی اور جب ان سے رابطہ کیا گیا تو انھوں نے یہی روایتیں بیان کیں کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا تھا کہ جب ایسے حالات پیدا ہوجائیں تو ﴿فَكَسِّرُوا قِسِيَّكُمْ، وَقَطِّعُوا أَوْتَارَكُمْ، وَاضْرِبُوا سُيُوفَكُمْ بِالْحِجَارَةِ﴾ (ابوداود) ''اپنی کمانیں توڑ ڈالو، اپنی ڈھالیں پاش پاش کردو اور اپنی تلوار پتھر پر مار (کر کند کر) دو''۔

حالتِ امن اور غربتِ اسلام

ہم دو طرح کے حالات اور ان میں عزلت کا حکم معلوم کر چکے۔ اب تیسری صورت جسے ''حالتِ امن اور غربتِ اسلام'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یعنی ایسا وقت ہو کہ معاشرہ، سماج اور ریاست دین سے دور ہے، لیکن حالات امن کے ہیں۔ دین کی بات کرنا ممکن ہے، اپنے دین وایمان کو کوئی خطرہ بھی لاحق نہیں ہے۔ تو ان حالات میں عزلت نہیں بلکہ خلوت کی ضرورت ہے۔ یعنی ان حالات میں مستقل اور کلی علیحدگی یعنی عزلت اختیار کرنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اصل رویہ تو اختلاط کا ہے، جب لوگ آپ کی تعلیم وتربیت، دعوت وتبلیغ وغیرہ کے محتاج ہیں تو ان سے صرف نظر کر کے عزلت (مستقل علیحدگی) اختیار کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ دین کی تبلیغ وتربیت وغیرہ کے لیے عام معاشرتی زندگی

اختیار کیے رکھنا بہتر ہے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ اس ماحول میں خلوت کی ضرورت نہیں ہے سوے فہم ہے۔ اس لیے کہ نفس کی جبلتوں کو قابو میں کرنے کے لیے اور نفس کی اصلاح کے لیے خلوت کی ضرورت بہت زیادہ ہے۔ خصوصا دور جدید کی برائیوں کے تناظر میں دیکھیں تو لگتا ہے کہ اس کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے کہ انسان وقتاً فوقتاً اس بھیڑ بھاڑ سے اپنے آپ کو دور کرے اور کچھ خلوت اختیار کرے تاکہ اللہ کی عبادت میں ریاضت کر کے اپنی روحانیت کو مضبوط کر سکے۔ یہی وہ روحانی قوت ہوگی جو اسے نفس کی مداخلتوں، غلط ماحول کے حملوں اور جدید دور کی سازشوں سے بچا سکے گا۔

خلوت گزینی ایک فطری عمل

ویسے آپ دیکھیے کہ انسان کے اندر یہ جذبۂ تَبَتُّل رکھا تو گیا ہے، قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو آپ کو یہ بات معلوم ہوگی کہ جب انسان کے اندر اللہ کی طرف لپک پیدا ہوتی ہے تو اس کا فطری اظہار ذکر، عبادت اور تبتل ہی میں ہوتا ہے۔ اسی کی ایک صورت اعتکاف ہے، اس کے علاوہ ایک اور چیز جو اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو دے رکھی ہے وہ قیام اللیل ہے، یہ بھی تبتل یا خلوت کا بہت اچھا موقع ہے کہ جیسے یہ انسان کا بالکل Private Face ہے اور اس میں انسان اپنی نیند کا ایثار کر رہا ہے۔ لہذا، اپنے درس و تدریس، خطبہ و خطابت، تصنیف و تالیف، تعلیم و تعلم، جس طرح کی بھی دینی مصروفیت آپ کی ہو اس کے ساتھ کچھ وقت خلوت کا رکھنا چاہیے، جس میں اپنے رب سے لو لگائی جا سکے۔

خلوت کے فوائد

امام غزالی علیہ الرحمہ نے خلوت و عزلت کے جو کچھ فوائد بتائے ہیں:

پہلا فائدہ "التفرّغ للعبادة والفكر والإستئناس بمناجاة الله" اللہ کی عبادت کے لیے اور غور و فکر کے لیے فراغت حاصل کرنا اور اللہ تعالی سے دعا و مناجات میں دل لگانا۔ جب انسان خلوت اختیار کرے گا تو عبادت کے لیے کچھ فارغ ہو جائے گا اور ظاہری بات ہے کہ انسان کا مقصدِ زیست ہی عبادت ہے۔ انسان خلوت اختیار کرے گا تو تعبّدی امور میں انسان کے لیے یکسوئی ہوگی اور وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی میں یکسو ہو سکے گا، اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی طرف متوجہ ہو گا۔

دوسرا فائدہ: "التخلص بالعزلة عن المعاصي" تنہائی کی بدولت گناہوں سے چھٹکارا۔ معاشرے میں بہت سے گناہ ایسے ہیں کہ اگر انسان خلوت اختیار کر لیا کرے تو ان سے بچ سکتا ہے، ایک تو یہ ہے کہ اگر ہر وقت لوگوں میں گھلا ملا

رہے گا، لوگوں کے معمولات دیکھے گا، لوگوں کے بارے میں باتیں کرے گا یا باتیں سنے گا تو بہت سے گناہوں میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، مثلاً غیبت، جو ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے، پھر اسی طرح امر بالمعروف ونہی عن المنکر نہ کرنا یعنی انسان لوگوں میں گھلا مِلا رہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرے، لیکن اپنی کمزوری کی وجہ سے انسان اس میں کوتاہی کرتا ہے، ایسا انسان اگر خلوت اختیار کرلے تو اس کوتاہی سے بچ سکتا ہے۔

تیسرا فائدہ ”الخلاص من الفتن“ فتنوں سے بچاؤ۔ خلوت نشینی سے انسان فتنوں سے اپنے آپ کو محفوظ کرلیتا ہے۔

چوتھا فائدہ ”الخلاص من شر الناس“ لوگوں کے شر سے بچاؤ۔ لوگوں کی طرف سے جو اذیتیں اور تکالیف پہنچائی جاتی ہیں، اگر انسان لوگوں سے دوری کا رویہ اختیار کرے گا تو اس سے بھی اس کی بچت ہوجائے گی۔ مثلاً بدگمانی، تہمت، غیبت، ایذایا جان، مال، آبرو کے ضمن میں جتنی بھی تکالیف ہیں، انسان خلوت میں رہ کر ان سے بچ جائے گا۔

پانچواں فائدہ: ”قطع الطمع“ طمع ختم ہوجانا۔ انسان ہر وقت لوگوں میں گھلا مِلا رہتا ہے تو لوگوں سے توقعات وابستہ ہوجاتی ہیں، اور پھر انسان ہر وقت لوگوں سے یہ خیال کرتا ہے کہ مجھے اِس سے یہ فائدہ پہنچ سکتا ہے اور اُس سے یہ فائدہ پہنچ سکتا ہے، یہ کوئی اچھی حالت نہیں ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے ﴿أَجْمِعِ الْيَأْسَ عَمَّا فِي أَيْدِي النَّاسِ﴾ (ابن ماجہ) ”جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے اپنے اندر مایوسی پیدا کرلو“۔ تو انسان جب لوگوں سے علیحدہ ہوجائے گا تو پھر کچھ توقعات بھی نہیں رہیں گی لوگوں سے اور لوگوں سے لالچ کا معاملہ بھی نہیں ہوگا۔

چھٹا فائدہ ”الخلاص من مشاهدة الثُقَلَاءِ والحَمقَى“ ثقلاء ثقیل کی جمع ہے یعنی ایسے لوگ جن کا دیکھنا ہی انسان پر بار ہے، ثقلاء کی مختلف تعبیرات کی گئی ہیں، بعض نے انھیں اہل بدعت کہا، بعض نے اہل شر کہا، بہر حال کچھ لوگ ہوتے ہیں جو بہت ہی پلید، بہت ہی احمق ہوتے ہیں، جیسے ان کا دیکھنا انسان پر بار بن جاتا ہے، تو خلوت میں اس طرح کے لوگوں کو دیکھنے سے انسان کی رستگاری ہوجاتی ہے، انسان کی بچت ہوجاتی ہے کہ اس طرح کے احمقوں کو دیکھے کیونکہ ان سے معاملہ کرنا بجائے خود ایک اذیت ہے تو خلوت میں انسان اس اعتبار سے بھی محفوظ رہتا ہے۔ بلکہ اس اعتبار سے تو یہ گوشہ نشینی انسان کے لیے راحت و آرام کا سبب ہے۔ امام بخاری علیہ الرحمہ نے ایک ترجمۃ الباب

میں لکھا ہے: الْعُزْلَةُ رَاحَةٌ مِنْ خُلاَّطِ السُّوءِ عزلت برے لوگوں سے خلاصی اور راحت کا نام ہے۔

اپنا اپنا حصہ

آخر میں ہم پھر عرض کرتے ہیں کہ طویل مدت کے لیے الگ تھلگ رہنا جسے ہم نے عزلت کہا تھا، وہ عام حالات میں بہر حال پسندیدہ نہیں ہے، ہم اس سے کم تر علیحدگی، جو کم وقت کے لیے ہو جسے ہم نے خلوت کا نام دیا تھا اس کی بات کر رہے ہیں، اسے عارضی عزلت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ یہ بہت مفید ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ایک قول روایت کیا جاتا ہے ﴿خُذُوا بِحَظِّكُمْ مِنَ الْعُزْلَةِ﴾ (العزلة للخطابي) ''عزلت میں سے اپنا حصہ لیا کرو''۔

تو خلوت میں سے اپنا اپنا حصہ لینا چاہیے۔ ہم اتنا حصہ تو لے ہی سکتے ہیں کہ کچھ مدت کے لیے خلوت اختیار کر لیا کریں۔ مہینے میں کم از کم ایک دن مخصوص کریں، اس میں آپ تھوڑا سا لوگوں سے علیحدہ ہوں اور تمام سماجی رابطے منقطع کر دیں۔ اس میں اپنی زندگی، موت، آخرت پر کچھ غور و فکر کر لیا جائے۔ اپنی قبر اور قیامت کے بارے میں کچھ سوچا جائے۔ اللہ تعالی کے ذکر، اللہ کی کتاب کے ساتھ، اور عبادت میں کچھ اشتغال پیدا کیا جائے، دعا و مناجات میں دل لگایا جائے۔

پہلے یہ بات عام ہوتی تھی کہ ہفتے میں ایک دن لوگ صبح مسجد میں گئے تو پورا دن مسجد میں گزار دیا، یا پھر یہ بات تو عام تھی کہ عصر میں گئے ہیں تو عشا پڑھ کر واپس آئیں گے۔ یہ بھی خلوت کے طریقے ہیں اور اس کے مواقع ہمارے لیے بھی کھلے ہوئے ہیں کہ ہم کچھ وقت اس طریقے سے اپنے آپ کو دیا کریں۔ یہ وقت نہ صرف یہ کہ ہمارے لیے آخرت کا خزانہ ثابت ہو گا بلکہ دنیا میں بھی ہماری دینی و اخلاقی تربیت میں معاون ہو گا۔

سوانح مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

حافظ حماد احمد ترک

اگر دورِ حاضر میں کسی سلسلے کو سلسلۃ الذہب کہا جائے تو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا سلسلہ اس لقب کا زیادہ حقدار ہو گا۔ اس سلسلے کی ہر ہر کڑی بذاتہ عروۃ الوثقیٰ ہے جس سے تفسیر، حدیث، فقہ، فتویٰ اور خصوصا تزکیہ و تصوف کے ایسے عمدہ خزانے بر آمد ہوئے کہ جن سے ان علوم نے سالوں میں صدیوں کا سفر طے کیا۔ ان حضرات میں سے ہر ہستی بلا شبہہ جامع العلوم و الفنون ہے۔ اس مبارک سلسلے کا آغاز قاسم العلوم و الخیرات حضرت مولانا قاسم نانوتوی صاحب (رحمہ اللہ تعالیٰ و متعنا بعلومہ و برکاتہ) سے ہوا اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ، حکیم الامت حضرت مولانا شیخ اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ سے ہوتا ہوا حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ تک پہنچا۔ تادمِ تحریر شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہ اسی سلسلے کی عظیم یادگار ہیں۔

اس مضمون سے مفتی اعظم پاکستان کی سیرت اور ان کے علمی کارناموں کا تذکرہ مقصود ہے۔ یہ مضمون اصلاً چند علماء کی عبارات پر مشتمل ہے۔ آپ رحمہ اللہ کی علمی خدمات، للّٰہیت اور اخلاص ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ رحمہ اللہ کو ''مفتی اعظم'' کا لقب ملا، اس بارے میں مفتی محمد تقی صاحب مدظلہ ''میرے والد۔ میرے شیخ'' میں فرماتے ہیں: ''علومِ متداولہ میں جس علم سے حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کو سب سے زیادہ شغف رہا اور جس میں اللہ تعالیٰ نے ان سے دین کی عظیم خدمت لی، وہ علمِ فقہ ہے۔ چنانچہ آپ رحمہ اللہ کی یہی حیثیت دنیا میں زیادہ معروف بھی ہوئی اور اسی بنا پر آپ کا لقب ''مفتی اعظم'' زباں زد عام ہو گیا۔ میں نے کئی بار تحقیق کرنی چاہی کہ سب سے پہلے کن صاحب نے حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کے لیے ''مفتی اعظم'' کا لقب استعمال کیا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا، البتہ اتنا یاد ہے کہ جب سے میں اُردو تحریر پڑھنے کے قابل ہوا اس وقت سے حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کے نام آنے والے خطوط میں والد صاحب رحمہ اللہ کے اسمِ گرامی کے ساتھ ''مفتی اعظم پاکستان'' کے الفاظ دیکھنے میں آرہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ کسی لقب یا

خطاب کے من جانب اللہ ہونے کی علامت غالباً یہی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی زبان پر اس طرح چڑھ جاتا ہے کہ یہ پتا نہیں چلتا کہ اس کی ابتدائی تجویز کس نے کی؟ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کو میں نے دیکھا کہ انھوں نے اپنے بے تکلف لوگوں کو یہ الفاظ لکھنے سے بعض اوقات منع کیا، لیکن اس کے باوجود یہ لقب پھیلتا ہی چلا گیا"۔[1]

آپ رحمہ اللہ معقولات و منقولات کے جامع ہونے کے علی الرغم سادگی اور عاجزی و انکساری کا پیکر تھے۔ آپ رحمہ اللہ کے متعلق مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب زید مجدہ "حیاتِ مفتیِ اعظم رحمہ اللہ" میں فرماتے ہیں کہ جب آپ رحمہ اللہ سے آپ کی سوانح لکھنے کا تذکرہ ہوا تو آپ رحمہ اللہ نے فرمایا: "ہماری مثال ان حشرات الارض کی سی ہے جو روز پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں، کسی مکھی مچھر کی سوانح کون اور کیوں لکھے؟ ہم جیسے لوگوں کا تذکرہ اس سے زیادہ ممتاز نہیں بلکہ بزرگانِ سلف کے سوانح اور تذکروں کی قدر کم کردینے کا سبب معلوم ہوتا ہے"۔[2]

آپ رحمہ اللہ کے یہ الفاظ ہر اس شخص کے لیے ابد الآباد تک ذریعۂ ہدایت بنے رہیں گے جسے کسی بھی کمال کے حصول پر "کچھ ہونے" کا احساس ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے مبارک قول ﴿من تواضع لله رفعه الله﴾ (مشکوۃ) کے جہاں دیگر مصداق ہیں وہیں آپ رحمہ اللہ کی ذاتِ گرامی بھی ہے۔

ابتدائی حالات

مفتیِ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ ۲۰ شعبان ۱۳۱۴ھ بہ مطابق جنوری ۱۸۹۷ء کو دیوبند میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا نے محمد مبین نام رکھا لیکن جب حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کو اطلاع ہوئی تو آپ رحمہ اللہ نے محمد شفیع نام تجویز کیا۔[3] آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ رحمہ اللہ کے والدِ ماجد مولانا محمد یٰسین صاحب عثمانی دیوبندی رحمہ اللہ دار العلوم دیوبند میں فارسی کے مدرس تھے اور ایک عالمِ باعمل اور صاحبِ کمالات بزرگ تھے۔[4] وہ فرمایا کرتے تھے کہ: "ہم نے دار العلوم کا وہ وقت دیکھا ہے جس میں صدر مدرس سے لے کر ادنیٰ مدرس تک اور مہتمم سے لے کر دربان اور چپڑاسی تک سب کے سب صاحب نسبت بزرگ اور اولیاء اللہ تھے۔ دار العلوم اس زمانے میں دن کو دار العلوم اور رات کو خانقاہ معلوم ہوتا تھا کہ اکثر حجروں سے شب میں تلاوت اور ذکر کی آوازیں سنائی دیتی تھیں"۔[5]

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کے والد ماجد مولانا محمد یٰسین صاحب رحمہ اللہ نے طالبِ علمی کا پورا زمانہ عسرت اور تنگ دستی میں بسر کیا۔ ایک روز آپ گرمی کی دوپہر میں دار العلوم کے اسباق سے تھک تھکا کر چھٹی کے وقت گھر پہنچے تو والدہ نے آبدیدہ ہوکر اپنے لائق فرزند سے کہا: ''بیٹا آج تو گھر میں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے البتہ ہماری زمین میں گندم کی فصل تیار کھڑی ہے اگر تم اس میں سے کچھ گندم کاٹ لاؤ تو میں ان کو صاف کر کے آٹا پیس کر روٹی پکادوں گی''۔ سعادت مند بیٹا محنت اور بھوک سے درماندہ اسی گرمی کی دوپہر میں اپنی زمین کی طرف چل دیا اور وہاں سے جس قدر بوجھ اٹھا سکتا تھا اتنی گندم کاٹ کر لے آیا۔ والدہ نے اس کو کوٹ کر چھان پیس کر آٹا بنایا اور روٹی پکائی۔ اس طرح ظہر کے وقت تک بھوک کا کچھ سامان ہوا۔ ظہر کے بعد اپنے اسباق کے لیے چلے گئے۔ ماں باپ اور بیٹے نے اسی فقر و فاقے میں وقت گزارا مگر تعلیم میں فرق نہ آنے دیا۔ اسی طرح کے دیگر واقعات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ رحمہ اللہ نے ایک علمی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ [6]

ابتدائی تعلیم

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ نے پانچ سال کی عمر میں حافظ محمد عظیم صاحب کے پاس دار العلوم دیوبند میں قرآن کریم کی تعلیم شروع کردی۔ وہیں فارسی کی تمام مروجہ کتب اپنے والدِ محترم رحمہ اللہ سے پڑھیں۔ حساب و فنون و ریاضی کی تعلیم اپنے چچا مولانا منظور احمد صاحب رحمہ اللہ سے حاصل کی اور ۱۶ سال کی عمر میں دار العلوم دیوبند کے درجۂ عربی میں داخل ہوئے۔ [7]

آپ کے والد بزرگوار کی خواہش تھی کہ آپ کو قرآن شریف حفظ کروائیں، کچھ پارے حفظ بھی کر لیے تھے مگر جسمانی طور پر بچپن سے کمزور تھے، حفظ کی محنت برداشت نہ ہوسکی، مگر چند پارے، جو اس وقت حفظ کر لیے تھے عمر بھر ان کو یاد رکھنے کا اہتمام فرماتے تھے۔ آپ یہ پارے اکثر نفلوں اور تہجد میں پڑھا کرتے تھے۔ قرآنِ کریم کی تعلیم سے فراغت کے بعد دار العلوم ہی میں خط و املاء کی مشق اور فارسی کی تمام مروجہ کتابوں کی تعلیم اپنے والدِ محترم سے حاصل کی، حساب، فنون، ریاضی، اقلیدس وغیرہ اپنے چچا جناب منشی منظور احمد صاحب رحمہ اللہ مدرس دار العلوم دیوبند سے پڑھے اور فنِ تجوید اپنے عربی علوم کے رفیقِ درس جناب قاری محمد یوسف صاحب میرٹھی سے حاصل کیا۔ عربی نحو

صرف اور فقہ کی ابتدائی کتابیں بھی فصول اکبری، ہدایۃ النحو اور منیۃ المصلی تک اپنے والد موصوف سے فارسی تعلیم کے ساتھ ہی پڑھ لی تھیں، اس طرح تعلیمِ قرآن کے بعد تقریبًا پانچ سال فارسی، ریاضی وغیرہ کی پوری تعلیم اور عربی کی ابتدائی کتب میں صرف ہوئے۔

دار العلوم دیوبند میں

۱۳۳۰ھ میں جب آپ کی عمر سولہ سال تھی، اصول فقہ اور ادب وغیرہ کی متوسط کتابیں دار العلوم دیوبند کے درجۂ عربی میں باقاعدہ داخل ہوکر شروع فرمائیں۔ آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس میں ہر طرف علم وعرفان اور زہد وتقویٰ کے وہ بے مثل پہاڑ تھے جن کی رگ رگ سے علوم و معارف کے بے شمار چشمے نکل کر عالمِ اسلام کو سیراب کر رہے تھے، اس روح افزا ماحول میں آپ رحمہ اللہ نے جن یکتائے روزگار اساتذہ سے استفادہ کیا، ان کو اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کا جنید، کرخی، ابن حجر، رازی اور غزالی بنایا تھا رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ آپ رحمہ اللہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ: ''اگر ہم اپنے بزرگوں کے تبحرِ علمی اور باطنی کمالات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ نہ کرتے تو ہمیں اپنے قدیم اسلام، تابعین، تبعِ تابعین کے حیرت ناک دینی کمالات کا مشاہداتی علم نہ ہوسکتا''۔[8] دار العلوم دیوبند میں آپ رحمہ اللہ کو جن اکابر علماء کی شفقت نصیب ہوئی ان میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی ذات گرامی بھی تھی۔ حضرت رحمہ اللہ نے شیخ الہند رحمہ اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے: ''احقر نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا زمانہ پایا مگر ضابطے کا تلمذ اس لیے نہیں ہوسکا کہ میں اس وقت متوسط کتابیں پڑھتا تھا مگر حضرت قدس سرہ کے ساتھ قلبی عظمت و محبت مجھے اکثر ان کے درس بخاری میں لے جایا کرتی تھی۔ قیدِ مالٹا سے پہلے دو سال تک رمضان المبارک میں حضرت ممدوح کے ساتھ شرکت کا شرف حق تعالیٰ نے عطا فرمایا۔ مالٹا سے واپسی کے بعد حضرت ہی سے بیعت و سلوک کا شرف حاصل ہوا''۔

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کو ضابطے کا تلمذ اگرچہ شیخ الہند رحمہ اللہ سے حاصل نہ ہوسکا لیکن اول تو جب بھی موقع ملتا آپ رحمہ اللہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے درس بخاری میں جا بیٹھتے اور یہ جا بیٹھنا محض رسمی عقیدت کا اظہار ہی نہ تھا بلکہ آپ رحمہ اللہ کو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے درسِ بخاری کی بہت سی باتیں یاد تھیں جو اکثر اپنے شاگردوں

اور خدام کے سامنے بیان فرمایا کرتے، اس کے علاوہ عصر کے بعد جب دوسرے طلبہ اپنے اپنے درس سے فارغ ہوکر کھیل کود کا یا تفریح کا اہتمام کرتے تھے، اس وقت آپ رحمہ اللہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی مجلس کا رخ کرتے اور روزانہ مغرب تک اس بابرکت مجلس سے فیض یاب ہوتے تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کو بھی آپ پر بے حد شفقت تھی اگر کسی روز آپ ان کی مجلس میں نہ ہوتے تو دریافت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ رحمہ اللہ کو بخار ہوا دو روز تک حاضر نہ ہوسکے تیسرے روز جب آپ پہنچے تو دیکھا کہ شیخ الہند رحمہ اللہ کہیں جانے کے لیے کھڑے ہیں معلوم ہوا کہ آپ ہی کے گھر جانے کا قصد فرمایا تھا۔

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کو اپنے شیخ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ سے جس قدر محبت و عقیدت تھی اور جتنا استفادہ آپ رحمہ اللہ نے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ سے کیا اس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کا جو تعلق حضرت حکیم الامت قدس سرہ سے تھا وہ اور کسی سے نظر نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ آپ رحمہ اللہ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کے حقیقی علمی اور روحانی جانشین تسلیم کیے گئے ہیں اور آپ کی رفعت و بلند پایہ شخصیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ آپ کے پیر و مرشد حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ نے متعدّد بار اپنی تحریرات و تقریظات میں آپ کی علمی قابلیت و فقہی بصیرت پر مکمل اعتماد و اطمینان کا اظہار فرمایا ہے اور یہ کسی معمولی شخص کی شہادت نہیں بلکہ اس شخص کی شہادت ہے جو حقیقی معنوں میں حکیم الامت اور مجدد اعظم تھا، مستند ہے ان کا فرمایا ہوا۔ حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کی مشہور تالیف "سیرتِ خاتم الانبیاء ﷺ" کے مطالعے کے بعد حضرت حکیم الامت قدّس سرُّہ ایک والا نامے میں تحریر فرماتے ہیں: "از اشرف علی عفی عنہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، القاب اس لیے نہیں لکھے کہ سمجھ میں نہیں آیا، آپ کے والد ماجد صاحب رحمہ اللہ کے تعلقاتِ اخوت پر نظر کر کے تو عزیزم لکھنے کو جی چاہتا تھا مگر آپ کے کمالات کو دیکھ کر اس کے لکھنے کو بے ادبی سمجھا"۔ عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے فرمایا: "مجھے اپنے مرنے کا کوئی ڈر نہیں کیونکہ بحمد اللہ چند لوگ ایسے موجود ہیں جو میرے بعد میرے خدمتِ دین کے کام کو آگے بڑھائیں گے، اس کے بعد حضرت رحمہ اللہ نے دو چار حضرات کے نام لیے جن میں مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا نام منفرد تھا"۔ اسی

طرح حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ: "مجھے اپنا ذوق بہت عزیز ہے اور یہ ذوق سالہا سال کے بعد مرتب ہوا ہے اور میرے ذوق و مسلک پر مفتی محمد شفیع پورے اترتے ہیں"۔[9]

آپ رحمہ اللہ کم سنی ہی سے محققانہ ذوق رکھتے تھے۔ طلبِ علم میں اس قدر منہمک رہتے کہ دن اکثر حصہ دار العلوم میں ہی گزرتا۔ تکرار کی ذمے دارے بھی بخوبی ادا کرتے بلکہ دورانِ تکرار استاذ کا پورا درس بعینہٖ دہرادیتے۔ آپ رحمہ اللہ کی تکرار بذاتِ خود ایک درس کی صورت اختیار کرگئی تھی۔ کبھی کبھی تو تکرار کے بعد دار العلوم میں مولسری کے درخت تلے کھلے فرش پر سو رہتے اور گھر جاتے تو کبھی رات کا ایک بج جاتا کبھی دو۔ حضرت رحمہ اللہ نے دار العلوم کراچی کے طلبہ کو ایک مرتبہ نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ: "رات کو والدہ میرا انتظار کرتی تھیں کہ کھانا گرم کرکے دیں، ان کے انتظار میں مجھے تکلیف ہوتی تھی، بڑی منت سماجت سے اس پر راضی کیا کہ میرا کھانا ایک جگہ رکھ دیا کریں۔ سردیوں کی راتوں میں شوربہ اوپر سے بالکل جم جاتا اور نیچے صرف پانی رہ جاتا۔ میں وہی کھاکر سو جایا کرتا"۔

ایک مرتبہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے مخصوص شاگرد و مرید اور مدرسہ عبد الرب دہلی کے بانی حضرت مولانا عبد العلی صاحب دارالعلوم تشریف لائے۔ معزز مہمان اور دوسرے اساتذۂ کرام کے ساتھ دارالعلوم کے اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ کھڑے تھے۔ قریب سے حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ بغل میں کتابیں دبائے گزرنے لگے تو مہتمم صاحب نے بلالیا اور معزز مہمان سے فرمایا: "یہ دار العلوم کا ایسا طالبِ علم ہے کہ اسے اپنی کتابوں کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں، نہ اپنے کپڑوں کی خبر ہے، نہ جان کی، کتاب کا کوئی سوال پوچھو تو محققانہ جواب دے گا"۔ مولانا عبد العلی صاحب رحمہ اللہ نے دیکھتے ہی فرمایا: "یہ تو مولوی یٰسین صاحب کا لڑکا معلوم ہوتا ہے"۔

ایک مرتبہ شرح جامی کا امتحان شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ کے پاس تھا۔ اس وقت تک آپ نے کوئی کتاب مولانا سے نہیں پڑھی تھی، تحریر سے نہ پہچان سکے، آپ کا نہایت ممتاز اور محققانہ پرچہ دیکھ کر حیرت و مسرت ضبط نہ کرسکے، پرچہ لے کر فوراً مہتمم صاحب کے پاس آئے اور پوچھا یہ کون طالبِ علم ہے اس نے تو اس کتاب کی شرح تصنیف کردی ہے۔ یہ سنتے ہی مہتمم صاحب فرطِ مسرت سے امتحان گاہ تشریف لائے، حضرت والد صاحب اس وقت کسی اور امتحان کا پرچہ لکھ رہے تھے۔ آپ کو بلاکر تمام طلبہ کے سامنے کھڑا کیا اور آپ کے سر پر ہاتھ

رکھ کر پرچے کی غیر معمولی خوبی کا اعلان فرمایا۔

الغرض حضرت رحمہ اللہ اسی انہماک سے علوم و فنون کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس دوران حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے ملاقات کا سلسلہ بھی جاری رہا تاآنکہ موقوف علیہ سے فراغت پاکر دورے میں داخلے کا وقت آیا۔ یہ ۱۳۳۴ھ کا زمانہ تھا، آپ رحمہ اللہ کی دلی تمنا تھی کہ بخاری حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے پڑھیں لیکن شیخ الہند رحمہ اللہ کا یہ عرصہ حجاز میں گزرا، اس امید پر آپ رحمہ اللہ نے دورۂ حدیث ملتوی فرمایا کہ اگلے سال حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے استفادے کا شرف حاصل ہو مگر بحکمِ قضا و قدر ۱۳۳۵ھ میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ انگریزوں کے اسیر ہوکر مالٹا جیل بھیج دیے گئے اور آپ رحمہ اللہ کی تمنا پوری نہ ہوسکی۔ بالآخر آپ رحمہ اللہ نے ۱۳۳۵ھ میں دورۂ حدیث محدث العصر حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کاشمیری رحمہ اللہ کے زیرِ شفقت کیا۔ حضرت انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ کے علمی کمالات، باطنی تقدس، دقتِ نظر، وسعتِ مطالعہ اور بالخصوص قوتِ حافظہ علمی حلقوں میں ضرب المثل ہیں۔ حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کی تصانیف میں علمی تحقیق اور وسعتِ مطالعہ کا جو رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے اس میں بڑا دخل حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی تعلیم و تربیت کا ہے۔ دورۂ حدیث مکمل کرتے ہی بعض کتب کی تدریس آپ رحمہ اللہ کے ذمے لگادی گئی اور اسی سال ۱۳۳۶ھ میں آپ رحمہ اللہ کی شادی ہوئی۔ ۱۳۳۷ھ میں باقاعدہ مدرس مقرر ہوئے اور ۱۲ سال تک یہ خدمت انجام دی۔ ۱۳۵۰ھ میں صدر مفتی کی حیثیت سے دار العلوم کا منصبِ فتویٰ سپرد ہوا نیز حدیث و تفسیر کی کچھ کتب زیرِ درس رہیں، بالآخر ۱۳۶۲ھ میں تحریکِ پاکستان کی جدو جہد اور کچھ دوسرے اسباب کی وجہ سے دار العلوم دیوبند سے مستعفی ہوگئے۔[10]

تعریفی کلمات از حضرت شاہ صاحب

دارالعلوم دیوبند میں آپ رحمہ اللہ نے امام العصر علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ کی راہنمائی میں آیتِ خاتم النبیین کی شرح عمدہ اور ادیبانہ انداز سے عربی میں تالیف فرمائی جو "هدية المهديين" کے نام سے شائع ہوئی، جس پر حضرت امام العصر رحمہ اللہ نے قابلِ رشک تقریظ تحریر فرمائی: "أما بعد : فإن صاحبنا الأ حوذي المولوي محمد شفيع الديوبندي-و فقه الله لما يحب و يرضاه-جمع بإستدعائى رسالته، هدية

المهديين في آية خاتم النبينﷺ، جزاه الله عني و عن سائر المسلمين خير الجزاء، أسرد فيه نحو مائة و خمسة و ستين حديثاً في انقطاع النبوة بعد مابعث الله نبيه محمداً مصطفاه... وهاک رسالة تفسيرية حديثية کلا مية فقهية و بعد ذلک كله أدبية يسري ألفاظها كسراية الروح في البدن و يقع في قلب المومن كحلاوة الإيمان ويجري في العروق كمحض اللبن ؎

هلم يَا صاحِ إِلى رَوْضَةٍ يجْلُو بِها العاني صدَا هَمِّهِ
نَسِيمُهَا يَعْثُرُ فِي ذيلهِ وَزَهْرُهَا يضْحَك فِي كُمِّهِ ''

(ہمارے رفیقِ دانشمند مولوی محمد شفیع دیوبندی نے - اللہ تعالیٰ انھیں اپنی مرضیات کی توفیق عطافرمائے - میری فرمائش پر رسالہ ھدیۃ المھدیین فی آیۃ خاتم النبیینﷺ جمع کیا ہے، اللہ تعالیٰ انھیں میری طرف سے اور تمام مسلمانوں کی جانب سے جزائے خیر عطا فرمائیں ،اس میں اس مضمون کی تقریباً ۱۶۵حدیثیں ذکر کی ہیں کہ بعثتِ محمد یہ ﷺ کے بعد نبوت ختم ہوچکی ہے۔ یہ رسالہ تفسیری بھی ہے اور حدیثی بھی، کلامی بھی ہے اور فقہی بھی اور ان تمام امور کے ساتھ ساتھ ادبی بھی، جس کے الفاظ روح کی طرح بدن میں سرایت کرتے ہیں، حلاوتِ ایمان کی طرح قلب مومن میں جاگزیں ہوتے ہیں اور خالص دُودھ کی طرح رگ وپے میں گردش کرتے ہیں۔ ''اے رفیق !اس گلشن کی سیر کرو، جس سے ایک غم زدہ شخص اپنے ہموم وافکار کا زنگ دُور کرتا ہے۔ اس کی بادِ صبا اس کے دامن سے اٹھکیلیاں کرتی ہے اور اس کی کلیاں اس کے دامن میں مسکراتی ہیں'')۔[11]

حکیم الامت رحمہ اللہ سے تعلق

آپ کی حکیم الامت سے پہلی ملاقات ۱۳۲۳ھ میں نوسال کی عمر میں ہوئی جب آپ اپنے والد کے ساتھ تھانہ بھوَن گئے۔ دوسری ملاقات ۱۳۳۲ھ میں ہوئی جب آپ کی عمر ۱۸سال تھی۔ اس ملاقات میں آپ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ سے مشورے کی غرض سے حاضر ہوئے کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی رائے یونانی فلسفہ پڑھنے کے حق میں نہ تھی، جبکہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ اس کے حق میں تھے، آپ فرمائیے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے جن خدشات کی بنا پر اس سے منع فرمایا تھا آپ ان سے محفوظ ہیں۔ حکیم الامت

رحمہ اللہ سے آپ کا باقاعدہ تعلق ۱۳۴۴ھ میں ہوا، آپ نے فرمایا کہ تمنا تو ہے کہ سلوک کے مراحل طے کروں لیکن یہ مجاہدے اور ریاضتیں تو اقویا ہی کے بس کی ہیں، حضرت رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ " آپ نے کیا فرمایا! اللہ کا راستہ صرف اقویا کے لیے ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ راستہ سب کے لیے کھلا ہوا ہے، ہاں عمل کے طریقے مختلف ہیں، ہم آپ کو ایسا طریق بتائیں گے جس میں نہ قوت کی ضرورت ہوگی نہ فرصت کی"۔ پھر فرمایا کہ فرائض، واجبات اور سنن و مستحبات جو سب مسلمان ادا کرتے ہیں وہ تو اپنی جگہ ہیں البتہ آپ کو تین باتوں کی پابندی کرنی ہوگی: ایک یہ کہ تقویٰ اختیار کریں ظاہری معاملات میں بھی اور باطنی معاملات میں بھی، دوسرے لایعنی کام، کلام، مجلس اور ملاقات سے پرہیز کریں اور تیسرے بقدرِ ہمت و فرصت کچھ تلاوتِ قرآن روز کیا کریں۔ نسخہ تو آپ کے لیے اتنا ہی ہے اگر دل چاہے اور فرصت ہو تو صبح و شام "سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الہ الا اللہ" سو سو مرتبہ اور استغفار و درود شریف سو مرتبہ پڑھ لیا کریں۔ نمازوں کے بعد تسبیحِ فاطمہ کا التزام کریں۔

حکیم الامت رحمہ اللہ کی نصیحت

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ بذریعۂ مکتوب حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ سے نصیحت کی درخواست کی تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا: "میرے تجربے سے جو چیز سب سے زیادہ نافع ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں ایک گھڑی رہنے کا بھی بھروسہ نہیں، وہاں کے لیے تیار رہنا چاہیے (اور پھر ایک روایت درج فرمائی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب تو صبح کرے تو اپنے نفس سے شام کی بات نہ کر اور جب تو شام کرے تو اپنے نفس سے صبح کی بات نہ کر اور اپنے آپ کو اہلِ قبور میں شمار کر)"۔

خلافت سے سرفرازی

ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ میں حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے بذریعۂ خط آپ رحمہ اللہ کو اپنی خلافت اور بیعت کی اجازت عطا کی، مکتوب یہ تھا: "مشفقی مولوی محمد شفیع صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند سلمہ، السلام علیکم: بے ساختہ قلب پر وارد ہوا کہ آپ کو مع دوسرے احباب کے بیعت و تلقین کی اجازت ہو، پس توکلاً علی اللہ اس وارد پر عمل کرنے کے لیے آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ اگر کوئی طالبِ حق آپ سے اس کی درخواست کرے تو قبول کرلیں، اس سے متعلم کے

ساتھ معلم کو بھی نفع ہوتا ہے، میں بھی دعا کرتا ہوں اور اپنے خاص محبین پر اس کو ظاہر بھی کردیجیے"۔

اس خط کے ملتے ہی آپ رحمہ اللہ تحیر میں مبتلا ہوگئے، آپ رحمہ اللہ کی تواضع اور انکساری نے آپ رحمہ اللہ کو یہ گمان بھی نہ گزرنے دیا تھا کہ کبھی یہ نوبت بھی آئے گی، چنانچہ آپ رحمہ اللہ نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو جوابی خط لکھا جو حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کی بے نفسی کی واضح دلیل ہے: "والا نامہ گرامی صادر ہوا، دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ ناکارہ و آوارہ شفیع اور بیعت کی اجازت و تلقین! صلاح کار کجا و من خراب کجا۔ میں تو واللہ کسی بزرگ سے بیعت ہونے کا بھی سلیقہ نہیں رکھتا، سلوک کے ابتدائی مراحل سے بھی روشناس نہیں، کسی دوسرے کو کیا تلقین کروں گا اور پھر ایسا کون بیوقوف ہوگا جو مجھ سے درخواستِ بیعت کرے گا، بار بار والا نامے کو دیکھتا اور اپنی سیہ کاری پر نظر کرتا ہوں تو حیرت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مجھ جیسے غفلت شعار سیہ کار کو اتنے بڑے منصب سے نوازنا کہیں اس منصب کی بدنامی کا سبب نہ ہو، اس خیال سے یوں جی چاہتا ہے کہ اس کی اشاعت نہ ہو تو اچھا ہے"۔

ایک اور مکتوب- تواضع کی انتہا

۹ رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ کو حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کی بارگاہ میں درج ذیل مکتوب ارسال فرمایا: "بارگاہِ سامی میں حاضر ہوکر حضرت کی جوتیوں کے طفیل سے الحمدللہ یہ تو ہوا کہ غرور سے ایک گونہ نجات ہوئی اور اپنے کچھ معائب گویا متمثل ہوکر۔

شرمندہ مثلِ زنگی آئینہ دیدہ ہوں

کی کیفیت پیدا ہوگئی اور یہ اچھی طرح واضح ہوگیا کہ تمام اہلِ خانقاہ میں سب سے زیادہ ناکارہ و آوارہ بدنام کنندۂ خانقاہ میں ہی ہوں، کئی روز سے حزن کی کیفیت اور حسرت بڑھ رہی ہے کہ جب آفتابِ ہدایت کے مواجہہ میں بھی میری تاریکی کا یہ حال ہے تو آئندہ کیا ہوگا"۔

جواب: "یہ استدلال متکلّم فیہ ہے، یہ ایسا استدلال ہے کہ ستارہ کہے کہ جب آفتاب کے سامنے بے نور ہوں تو شب کو کس قدر بے نور ہوں گا۔ بعض اوقات بعض احوال کا ظہور قُرب میں نہیں ہوتا بُعد میں ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ان فکروں ہی میں نہ پڑنا چاہیے جو ہوسکے کرتا رہے نہ ہوسکے نادم رہے"۔

سبحان اللہ !جس قدر شان وشوکت شیخ کی ہے ویسا ہی تبحر مرید کا بھی ہے، کثر اللہ أمثالھم۔

حکیم الامت رحمہ اللہ کی وفات

حکیم الامت رحمہ اللہ کی وفات کا واقعہ حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ بیان فرماتے ہیں کہ: ''میری عمر کا اس وقت آٹھواں سال تھا، بدھ ۱۳۶۲ھ کو صبح تقریباً نو یا دس بجے کا وقت تھا، بھائی جان جو کسی کام سے سہارنپور گئے ہوئے تھے، اچانک یہ المناک خبر لائے کہ رات حضرت رحمہ اللہ کا انتقال ہوگیا۔ سنتے ہی والد صاحب رحمہ اللہ کا حال ناقابلِ بیان ہوگیا، ابتداءً سکتہ سا ہوا، چہرے کی رنگت بدل گئی پھر بے تابانہ ٹہلتے جاتے اور اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھتے جاتے تھے، استغراق کا سا عالم تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمجھ نہیں آرہا کیا کریں، دیکھتے ہی دیکھتے گھر میں ہجوم ہوگیا، پورے دیوبند میں ہلچل مچ گئی، جس کو جو سواری ملی تھانہ بھون روانہ ہوگیا، جسے کچھ نہ مل سکا بائیسکل پر دوڑ پڑا۔ ایک ایک سائیکل پر کئی کئی سوار تھے، بہت سے لوگ پیدل ہی چل پڑے۔ والد صاحب رحمہ اللہ بھی چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں دیوبند پر سناٹا چھا گیا، تمام مرد نمازِ جنازہ میں شرکت اور آخری دیدار کے لیے تھانہ بھون جا چکے تھے۔

والد صاحب رحمہ اللہ کو یہ قلق ہمیشہ رہا کہ عین آخر وقت میں مجھے تھانہ بھون سے دیوبند آنا پڑ گیا اور آخری لمحات میں حضرت کی نظروں کے سامنے نہ رہ سکا۔ چنانچہ مکاتیبِ حکیم الامت رحمہ اللہ میں جہاں حضرت رحمہ اللہ کے نام اپنا آخری خط نقل کیا ہے، اس کے حاشیے پر یہ پورا واقعہ نقل کر کے بڑی حسرت سے یہ شعر لکھا ہے کہ:

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

(میں کارواں کے ساتھ چل رہا تھا کہ پاؤں میں کانٹا چبھ گیا، میں ٹھہرا کہ کانٹا نکالوں اتنے میں محمل نظروں سے اوجھل ہوگیا، میں نے ایک لحظہ غفلت برتی اور کارواں سے سو سال پیچھے رہ گیا)

اس حادثے پر آپ نے ایک اردو مرثیہ بھی کہا۔

وہ حکیمِ امتِ خیرُالوریٰ قطبِ ہدیٰ ۔۔۔ وہ دوا امت کے ہر بیمار کی، ناشاد کی
صدقِ صدیقی تھا جس میں حزمِ فاروقی کے ساتھ ۔۔۔ اک درخشاں یادگار اسلاف اور امجاد کی

مشعلِ راہِ ہدیٰ، نورِ محمد ﷺ کی ضیا
آہ وہ زندہ نشانی حضرتِ امداد رحمہ اللہ کی

حضرتِ اشرف علیِ تھانوی روحی فداہ
جن سے قائم تھیں ہزاروں مسندیں ارشاد کی

ہیں سبھی اہلِ کمال واہلِ دل مصروفِ کار
دیکھ لو خالی پڑی ہے ہر جگہ استاد کی

کیوں نہ ہوں چشمِ فلک سے خون کے آنسو رواں
کیوں نہ ہو روئے زمیں صف ماتم وفریاد کی

خستہ حالوں کے لیے اب ہے نہیں جائے پناہ
آسماں تانبے کا ہے آج اور زمیں فولاد کی

وائے ناکامی کہ ہم جیسے تباہ وخستہ دل
اور چھائی ہیں گھٹائیں ہر طرف الحاد کی

ناخدا گم کردہ ہے کشتی امت اے کریم
ہے زبوں حالت ہمارے مجمع وافراد کی

المدد بہرِ حبیبِ خوب الٰہی المدد
امتِ مرحوم پھر محتاج ہے امداد کی [12]

تحریکِ پاکستان میں مفتی اعظم رحمہ اللہ کا کردار

تحریکِ پاکستان کے آغاز سے ہی بہت سے علمائے کرام اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہو گئے خصوصا مولانا شاہ اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ نے پے بہ پے خطوط کے ذریعے قائد اعظم اور دیگر لیگی رہنماوں کی اصلاح کا کام انجام دیا، اسی ضمن میں ایک دفعہ مولانا تھانوی رحمہ اللہ کو یہ گمان گزرا کہ قائد اعظم دین کو سیاست سے الگ سمجھتے ہیں چنانچہ آپ نے اس نظریے کی اصلاح کے لیے ایک سہ رکنی وفد قائد اعظم کی خدمت میں بھیجا جو مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ، مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ پر مشتمل تھا۔ اس ملاقات میں ابتداءً قائد اعظم اپنے مقدمے پر مصر رہے لیکن اڑھائی گھنٹے کی گفتگو کے بعد قائد اعظم کے اس اعتراف پر مجلس ختم ہوئی کہ: ”دنیا کے کسی مذہب میں سیاست مذہب سے الگ ہو یا نہ ہو میری سمجھ میں اب خوب آگیا کہ اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہیں بلکہ مذہب کے تابع ہے“۔

جوں جوں پاکستان کا مطالبہ زور پکڑتا گیا اکابر علماءِ دیوبند اس معاملے میں دو گروہوں میں منقسم ہوتے چلے گئے۔ ایک گروہ کانگریس کے ساتھ تھا جو متحدہ ہندوستان کا حامی تھا جبکہ دوسرا گروہ جس میں مذکورہ تین علماء وغیرہم شامل تھے، ان علماء کو مولانا تھانوی رحمہ اللہ کی تائید حاصل تھی۔ جب یہ اختلاف زیادہ بڑھ گیا تو ۱۶ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ کے

دن علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی معیت میں کئی علماء نے دارالعلوم سے استعفیٰ دے دیا۔ اس استعفے کے وقت آپ رحمہ اللہ کا مشاہرہ ۶۵ روپے تھا۔ استعفے کے بعد آپ رحمہ اللہ (مفتی اعظم) تھانہ بھون حاضر ہوئے تو آپ رحمہ اللہ کو دیکھتے ہی حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے دیوان الحماسہ کا ایک مصرع کچھ تصرف کرکے اس طرح پڑھا: أَضَاعُوْكَ وَأَيَّ فَتًى أَضَاعُوْا (لوگوں نے تجھے اپنے ہاتھ سے کھودیا اور وہ کیسے عظیم انسان کو کھو بیٹھے)۔

جب کانگریس اور لیگی نظریوں کا اختلاف زبان زدِعام ہوا اور دونوں طرف سے مخلص اور امت کے خیر خواہ علماء نے برملا اپنی اپنی جماعت کے موقف کی تائید شروع کی تو حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ نے ۱۳۶۴ھ بمطابق ۱۹۴۵ء میں ایک مستقل رسالہ ”کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ“ تصنیف فرمایا۔ اسی طرح مولانا تھانوی رحمہ اللہ کے دس رسائل، متفرق مضامین اور ملفوظات و مکتوبات کا ایک مجموعہ مرتب کرکے کتابی شکل میں ”افاداتِ اشرفیہ در مسائلِ سیاسیہ“ کے نام سے شائع فرمایا۔ اسی طرح ۱۹۴۵ء کے انتخابات سے قبل آپ رحمہ اللہ کے ایک فتوے نے مسلم لیگ کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا جس میں کانگریس کو ووٹ دینے کی شرعی قباحتیں دلائل کے ساتھ درج تھیں، اس فتوے کو پوسٹروں کی صورت میں متعدّد جگہ چسپاں کیا گیا۔ اسی سال جمعیت علماءِ اسلام کا قیام بھی عمل میں آیا۔ یکم ربیع الاول ۱۳۶۶ھ بمطابق ۲۴ جنوری ۱۹۴۷ء کو جمعیت علماءِ اسلام کی ایک عظیم الشان کانفرنس حیدرآباد، سندھ میں منعقد ہوئی جس کی صدارت آپ رحمہ اللہ نے فرمائی۔ اس موقع آپ رحمہ اللہ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس کے متعلق مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب زید مجدہ فرماتے ہیں: ”یہ خطبہ سیاست کے اسلامی اصولوں کا بے نظیر مرقع ہے، اس میں آپ رحمہ اللہ نے سیاسی قیادت کے شرعی اصول، غیر شرعی امیر کی اطاعت کی شرعی حدود وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو فرمائی“۔ ۹ جون ۱۹۴۷ء کو قائدِ اعظم نے مرکزی اسمبلی کے تمام مسلم ارکان کا اجلاس دہلی میں طلب کیا، اگرچہ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ اسمبلی کے رکن نہ تھے مگر خصوصی دعوت پر اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت اور رسول اللہ ﷺ کے خصوصی فیض سے لیگی کارکنان اور جمعیت علماءِ اسلام کی کوششیں رنگ لائیں اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے وجود میں آیا۔[13]

ہجرت

دیوبند سے کراچی ہجرت کے متعلق فرماتے ہیں: ''۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ یکم مئی ۱۹۴۸ء میری عمر میں عظیم انقلاب کا دن تھا جس میں وطنِ مالوف مرکزِ علوم دیوبند کو خیر باد کہہ کر صرف چھوٹے بچوں اور ان کی والدہ کو ساتھ لے کر پاکستان کا رخ کیا۔ والدہ محترمہ اکثر اولاد اور سب عزیزوں اور گھر بار کو چھوڑنے کا دل گداز منظر اور جس طرف جا رہا ہوں وہاں ایک غریب الوطن کی حیثیت سے وقت گزارنے کی مشکلات کے ساتھ ایک نئی اسلامی حکومت کا وجود اور اس میں دینی رجحانات کے بروئے کار آنے کی خوش کن امیدوں کے ملے جلے تصورات میں غلطاں و پیچاں۔ دہلی اور چند مقامات پر اُترتے ہوئے ۲۶ جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ ۶ مئی ۱۹۴۸ء کو اللہ تعالیٰ نے حدودِ پاکستان میں پہنچا دیا اور کراچی غیر اختیاری طور پر اپنا وطن بن گیا''۔[14]

ملفوظات و واقعات

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مد ظلہ نے آپ رحمہ اللہ کے ملفوظات پر مشتمل ایک رسالہ ترتیب دیا ہے، آپ فرماتے ہیں: ''والد صاحب رحمہ اللہ اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے گھر میں ہم سے فرمانے لگے کہ قرآن مجید میں یہ ارشاد ہے کہ اگر والدین بوڑھے ہو جائیں تو ان کے سامنے اُف نہ کہو، نہ انھیں جھڑکو، بلکہ ادب سے پیش آؤ۔ قرآن مجید نے یہ کیوں کہا ''اگر والدین بوڑھے ہو جائیں، تو فلاں فلاں سلوک نہ کرو'' کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ماں باپ جوان ہوں تو انھیں اُف کہنا اور انھیں جھڑکنا جائز ہے، یا ان کے ساتھ تعظیم کا معاملہ نہ کرنا جائز ہے؟ ایسا ہرگز نہیں بلکہ جوانی میں ان کا احترام کرنا اور ان کے متعلق ان سارے اَحکام پر عمل ضروری ہے۔ ماں باپ بوڑھے ہوں یا جوان، ان کی تعظیم و تکریم بھی واجب ہے اور ان کے ساتھ کوئی ایسی بات کرنا جائز نہیں جن سے ان کو ناحق ادنیٰ تکلیف یا ناگواری پہنچے۔ جب یہ بات ہے تو پھر قرآن مجید میں بوڑھے ہونے کا ذکر کیوں کیا گیا؟ اس کا جواب خود دیتے ہوئے فرمایا کہ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ والدین کے سامنے اُف کرنے یا بدتمیزی کرنے کا اندیشہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب والدین بوڑھے ہو چکے ہوں، جب وہ باپ جوان ہو تو پھر کسی بیٹے کی کیا ہمت ہے کہ اُسے جھڑک دے، باپ جوتا اُٹھا کر ایسی پٹائی کرے گا کہ وہ ہمیشہ کے لیے یاد رکھے گا، یا گھر سے نکال دے گا۔ غرضیکہ جوانی میں باپ کے سامنے بدتمیزی

کر نہیں سکتا، جھڑکنا چاہے تو جھڑک نہیں سکتا، کبھی اس کی جرات اس وقت ہوگی جب والدین بوڑھے ہو چکے ہوں گے، اس وقت خطرہ ہے کہ بیٹے کہ ذہن میں یہ خناس پیدا ہو جائے کہ اب تو میں ان کو پال رہا ہوں اس لیے یہ فرمایا کہ اگر بڑھاپا آجائے تو یہ یہ کام کرو، اس کا یہ مطلب نہیں کہ جوانی میں بدتمیزی کرنا جائز ہے۔

ایک مرتبہ میرے والد ماجد حضرت مولانا شفیع صاحب قدس اللہ سرہ نے ہم سب بھائیوں کو جمع کیا اور فرمایا: آج تم سب بڑے خوش ہو اور فرصت میں ہو، لہٰذا آج تمھیں ایک فائدے کی بات بتاتا ہوں، جواب سے پہلے میرے اور اللہ کے درمیان راز تھا، میں اب بھی یہ راز نہ کھولتا مگر میں تمھیں اس وجہ سے بتا رہا ہوں کہ تمھارے فائدے کے لیے ضروری ہے۔ میں تمھارے اندر ایک کوتاہی دیکھتا ہوں، جب تمھاری والدہ تمھیں سودا سلف وغیرہ منگوانے کے لیے بھیجتی ہیں تو تم ایک دوسرے پر ٹال دیتے ہو اور شاید سودا لانے میں اپنی توہین سمجھتے ہو۔ میں کافی دِنون سے اس فکر میں تھا کہ کوئی مناسب موقع میسر آئے تاکہ تمھیں سمجھا سکوں۔ آج الحمد اللہ! خوشی کا موقع ہے، فرصت کا وقت مل گیا ہے اس لیے تمھیں اپنا راز بتا رہوں۔ پھر والد صاحب رحمہ اللہ نے اپنا قیامِ پاکستان سے پہلے دیوبند کا ایک واقعہ سنایا: ”ایک دن میں فجر کی نماز کے لیے گھر سے نکلا اور ہندوؤں کی بستی سے گزر کر مسجد جانے لگا تو راستے میں ایک کنویں کے پاس ایک بوڑھی عورت کو دیکھتا جو کنویں سے پانی بھر کر لا رہی تھی، اور گھڑے کے وزن کی وجہ سے مشکل سے چل رہی تھی، اُس عورت نے تھک کر گھڑا زمین پر رکھا اور سانس لینے لگی، مجھے اُس پر ترس آیا، میں اُس بوڑھی عورت کے پاس گیا اور اُس سے کہا: اماں! لاؤ تمھارا گھڑا میں اُٹھا دیتا ہوں، میں نے جب اُٹھایا تو اس کا وزن بہت زیادہ تھا، میں نے اتنا وزن شاید پہلے کبھی اٹھایا نہیں تھا، لیکن میں نے اُس بوڑھی عورت سے کہا تم آگے چلو اور مجھے راستہ بتاؤ، وہ غریبوں کے ایک قریبی محلے پہنچ کر چھوٹے سے ایک کچے پکے مکان کے پاس جا کر رُکی، یہ اُس کا گھر تھا، اس نے کہا کہ بیٹا! یہیں رکھ دو۔ میں واپس آنے لگا تو اُس غریب خاتون نے زور زور سے مجھے دُعائیں دینا شروع کر دیں اور وہ آواز مجھے دُور تک سنائی دیتی رہی۔ میں نے سوچا یہ تو بڑا سستا سودا ہے، اتنے سے کام پر ایک ضعیف خاتون کے دِل سے نکلی ہوئی دُعائیں مل رہی ہیں۔ چنانچہ اگلے دن میں نماز سے ذرا پہلے نکل گیا، جب کنویں کے پاس پہنچا تو اس بڑھیا نے پانی نکالنے کے لیے کنویں میں ڈول ڈالا ہوا تھا، میں نے کہا: اماں! تم ہٹ جاؤ میں پانی نکال دیتا ہوں، چنانچہ میں نے ڈول بھر کے پانی کا گھڑا سر پر

رکھ کر اُس کے گھر پہنچا دیا۔ اُس بوڑھی عورت نے راستے میں بھی دُعائیں دیں اور پہنچ کر بھی پھر میں نے روزانہ کا یہی معمول بنالیا، ہر روز نمازِ فجر سے پہلے جاتا اور اُس عورت کا گھڑا اُٹھا کر چھوڑ کے آتا۔ جب تک وہ بوڑھی عورت زندہ رہی الحمداللہ میرا یہی معمول رہا۔ چونکہ وہ وقت صبح منہ اندھیرے کا تھا، لہٰذا کسی شخص نے میرا یہ عمل نہیں دیکھا، یہ راز میرے، اُس بڑھیا کے اور اللہ رب العالمین کے درمیان تھا، کسی اور کو اس کا علم نہیں تھا۔

اس واقعے کے بعد حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے ہمیں ایک دُوسرا واقعہ بھی سنایا اور فرمایا کہ تھانہ بھون ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، اس کا اسٹیشن بھی بہت چھوٹا سا تھا، جس پر نہ تو بجلی تھی اور نہ ہی سامان اُٹھانے والے قلی۔ سردیوں کی ایک رات میں دیوبند سے تھانہ بھون گیا اور اسٹیشن پر جا کر اُتر گیا، گاڑی مجھے اُتار کر روانہ ہوگئی، رات کا وقت تھا اور بستی کافی دُور تھی۔ اسی سناٹے میں مجھے ایک آواز سنائی دی: قلی، قلی، قلی میں سمجھ گیا کوئی نووارِد ہے جس کو یہاں کا حال معلوم نہیں۔ اسی دوران مجھے کچھ سائے نظر آئے جن میں ایک مرد کے ساتھ کچھ خواتین بھی تھیں اور سامان بھی، اور رات کی تاریکی اور سردی سے وہ پریشان دِکھائی دے رہے تھے، میں نے سوچا اگر میں اسی حالت میں جا کر ان کا سامان اُٹھاؤں گا تو وہ مجھے پہچان لیں گے اور سامان اُٹھانے نہیں دیں گے۔ جب انھوں نے پھر قلی، قلی کی آواز نکالی تو میں نے اپنی چادر اپنے منھ پر لپیٹی اور قلی کے بھیس میں اُن کے پاس جا کر کہا قلی آگیا ہے، وہ خوش ہوئے اور ایک بھاری صندوق میرے سر پر رکھ دیا۔ وہ ایک اور صندوق بھی رکھنے لگے، لیکن میں نے اُن سے کہا: میں کمزور ہوں، سر پر ایک ہی صندوق رکھ سکتا ہوں کچھ سامان ہاتھ میں اُٹھالوں گا، باقی آپ خود اُٹھالیں۔ چنانچہ میں اپنی ٹارچ جلا کر اُن کو راستہ بتاتے ہوئے آگے آگے چلنے لگا کیونکہ اگر ٹارچ اُن کو دیتا خود آگے چلتا تو وہ مجھے پہچان جاتے۔ آخر کار اُن کو ان کی منزل پر پہنچا کے چپکے سے غائب ہوگیا۔ اگلے دِن اُن ہی صاحب سے خانقاہ میں ملاقات ہوئی، وہ میرے ساتھ عرصہ دراز سے بڑی محبت رکھتے تھے، لیکن آج تک انھیں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ قلی کون تھا جو پیسے لیے بغیر چلا گیا تھا۔

میرے والد صاحب رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ اپنا یہ واقعہ سنایا، یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب ہندوستان میں انگریزی کی حکومت تھی، اور ابھی تک پاکستان نہیں بنا تھا۔ فرمایا کہ: ایک مرتبہ میں ریل میں سفر کر رہا تھا، رات بھر کا سفر تھا اور رش بھی بہت تھا، میرے برابر ایک بوڑھا بنیا آکر بیٹھ گیا۔ بوڑھا بھی تھا، کافر بھی تھا اور کافر بھی ہندو۔ ہندوؤں کی

مسلمان دُشمنی بہت پُرانی اور مشہور ہے۔ تھوڑی دیر میں جب گاڑی چل پڑی تو اس کو نیند آگئی تو اس نے اپنا سر میرے کندھے پر ٹیک دیا، اب مجھ پر دُہری مشکل پڑگئی، ایک تو خود جاگنے کی اور دُوسرے یہ کہ کہیں اس کی نیند خراب نہ ہوجائے۔ چنانچہ میں ساکت اور ساکن بیٹھا رہا، بالکل ہلا جلا نہیں، نجانے کتنے گھنٹے میں نے اس طرح گزارے۔

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے تقریباً ہر بیان میں یہی فرمایا کہ بھائی اپنے بچوں میں، اولاد میں جس کو اللہ نے ایک سے زیادہ بیٹے دیے ہیں، وہ ایک بیٹا اللہ کے راستے میں نکالے، اس کو عالمِ دین بنائے، ہندوستان پاکستان کے مدارس میں بھیج کر ان کو ماہر عالمِ دِین بنائے تاکہ وہ یہاں آکر دِین کا کام کریں۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے تھے کہ یاد رکھیں! جو صاحب اپنے ایک سے زیادہ بیٹوں میں سے ایک کو دین کے کام کے لیے نکالیں وہ باقیوں کو، ظاہر ہے کہ اپنے کاروبار میں لگائیں گے، تو جتنا حصہ اُن بیٹوں کو دیں جو کاروبار میں کام کر رہے ہوں، اتنا ہی حصہ اُس بیٹے کو بھی دیں جس کو علمِ دِین میں لگایا ہوا ہے۔

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ بڑے مہربان اور شفیق باپ تھے۔ وہ فقیہ الملت اور ولی اللہ تھے۔ میں نے اُن سے دنیا کے لیے دُعا کی درخواست نہیں کی تھی، بلکہ حج کے لیے کی تھی، اس پر حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں تمھارے لیے حج کی دُعائیں نہیں کروں گا! اور یہ بات سنجیدہ ہوکر فرمائی، مذاق میں نہیں فرمائی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے وجہ پوچھی، تو وہ فرمانے لگے کہ تمھیں حج کا شوق نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے تو حج کرنے کا بہت شوق ہے، جب میں آپ سے حج کے حالات سنتا ہوں تو تنہائی میں روتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا کہ نہیں! تمھیں حج کا شوق نہیں ہے، اگر تمھیں حج کا شوق ہوتا تو تم اس کے لیے کچھ تیاری کرتے! بتاؤ تم نے کچھ تیاری کی؟ تم نے کتنے پیسے جمع کیے؟ میں نے کہا کہ میں نے تو کوئی پیسے جمع نہیں کیے۔ کیونکہ اس زمانے میں میری ڈیڑھ سو روپے پاکستانی تنخواہ تھی اور میری بچی بھی تھی۔ میں ان پیسوں میں کیسے تیاری کرتا! اس پر فرمایا: کیا تم مہینے میں ایک روپیہ بھی نہیں بچا سکتے تھے؟ میں نے عرض کیا کہ مہینے میں ایک روپیہ تو بچا سکتا ہوں۔ پھر فرمایا کہ بتاؤ! تم نے کتنے جمع کیے؟ اگر تمھیں حج کا شوق ہوتا تو تمھاری جتنی قدرت تھی اتنے پیسے تو ضرور جمع کرتے۔

اس کے بعد حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے ہماری سب سے بڑی بہن کا ایک واقعہ سنایا۔ ان کی زندگی زیادہ تر

غربت اور افلاس میں گزری تھی، ان کا اڑتالیس سال کی عمر میں کراچی ہی میں انتقال ہوگیا۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ جب تمھاری بہن کا انتقال ہوا تو اُن کے سامان میں سے ایک بٹوا نکلا، اُس بٹوے کے اندر پینتیس روپے تھے اور یہ پرچہ پڑا ہوا تھا کہ یہ پیسے حج کے لیے ہیں۔ اس بچاری کو شادی کے بعد جتنے سال ملے تھے اُن میں اُس نے ایک ایک آنہ، دو دو پیسے کر کے یہ پینتیس روپے حج کے لیے جمع کیے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس پینتیس روپے میں حج کرادیا۔ وہ اس طرح کہ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں پچھلے سال جب حج کے لیے گیا تو اُس کے پینتیس روپے لے گیا تھا، اُس کے اُوپر حج فرض تو نہیں تھا لیکن اُس کو شوق تھا، تو اُس کا نفلی حج وہیں سے بھی کرایا جاسکتا تھا، اس لیے میں نے وہیں مکہ معظّمہ کے رہنے والے ایک آدمی کو وہ حج کے پیسے دے دیے کہ تم میری بیٹی کی طرف سے حج کرلو، اس وقت منیٰ، عرفات اور مزدلفہ کا خرچہ ۳۵ روپے کے اندر ہوجاتا تھا، اس طرح اللہ پاک نے اُن کا حج کرادیا۔[15]

جاری ہے۔۔۔

1 میرے والد میرے شیخ، مفتی محمد تقی عثمانی، مکتبہ معارف القرآن، جنوری ۲۰۰۹ء، ص:۴۱

2 حیاتِ مفتی اعظم رحمہ اللہ، مفتی محمد رفیع عثمانی، ادارۃ المعاف کراچی، مئی ۲۰۰۵ء، ص:۱۱

3 حیاتِ مفتی اعظم رحمہ اللہ، مفتی محمد رفیع عثمانی، ادارۃ المعاف کراچی، مئی ۲۰۰۵ء، ص:۲۴

4 مقالاتِ مفتی اعظم رحمہ اللہ، محمد کبر شاہ بخاری، دار الاشاعت کراچی، مئی ۲۰۰۵ء، ص:۸

5 حیاتِ مفتی اعظم رحمہ اللہ، مفتی محمد رفیع عثمانی، ادارۃ المعاف کراچی، مئی ۲۰۰۵ء، ص:۲۰

6 حیاتِ مفتی اعظم رحمہ اللہ، مفتی محمد رفیع عثمانی، ادارۃ المعاف کراچی، مئی ۲۰۰۵ء، ص:۱۹

7 مفتی اعظم رحمہ اللہ پاکستان کے مشہور خلفاء و تلامذہ، محمد اکبر شاہ بخاری، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۳۱ھ، ص:۲۹

8 حیاتِ مفتی اعظم رحمہ اللہ، مفتی محمد رفیع عثمانی، ادارۃ المعاف کراچی، مئی ۲۰۰۵ء، ص:۲۷

9 مفتی اعظم رحمہ اللہ پاکستان اکابر و معاصرین کی نظر میں، محمد کبر شاہ بخاری، ادارہ اسلامیات لاہور، ص:۱۲-۲۴

10 حیاتِ مفتی اعظم رحمہ اللہ، مفتی محمد رفیع عثمانی، ادارۃ المعاف کراچی، مئی ۲۰۰۵ء، ص:۳۰-۳۱/۳۸-۴۱/۹۸/۱۲۲

11 ماہنامہ البلاغ، مفتی اعظم رحمہ اللہ نمبر، ص:۳۲-۳۳

12 حیاتِ مفتی اعظم رحمہ اللہ، مفتی محمد رفیع عثمانی، ادارۃ المعاف کراچی، مئی ۲۰۰۵ء، ص:۳۱/۳۳/۴۶-۴۸/۷۷-۷۳/۱۳۳-۱۳۲

13 حیاتِ مفتی اعظم رحمہ اللہ، مفتی محمد رفیع عثمانی، ادارۃ المعاف کراچی، مئی ۲۰۰۵ء، ص:۱۲۶-۱۴۱

14 مقالاتِ مفتی اعظم رحمہ اللہ، محمد کبر شاہ بخاری، دار الاشاعت کراچی، مئی ۲۰۰۵ء، ص:۳۲-۳۴

15 ملفوظات و واقعات، مفتی محمد رفیع عثمانی، ادارۃ المعاف کراچی، فروری ۲۰۱۱ء، ص:۱۱/۱۵-۱۹/۴۱/۴۴-۴۵

تفقہ فی الدین

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

﴿عَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِي الله عَنهُ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ، وَإِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللهُ يُعْطِي ، وَلَنْ تَزَالَ هَذِهِ الأُمَّةُ قَائِمَةً عَلَى أَمْرِ اللهِ لاَ يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللهِ﴾ ”سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا، آپ فرماتے تھے: اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین میں سمجھ دیتا ہے اور بے شک میں تو تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ ہی عطا کرتا ہے اور یہ امت اللہ کے امر پر اس طرح قائم رہے گی کہ اس کی مخالفت کرنے والا بھی انھیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے“۔

یہ ایک جامع حدیث ہے۔ شیخ عبدالکریم الخضیر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اس حدیث کی شرح (کرنے یا سیکھنے) میں ایک یا دو سال لگا دے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں اور اگر کوئی شخص اس حدیث کی شرح پر کوئی تصنیف کرے اور کل علم اس کے ذیل میں بیان کر دے تو تعجب کی بات نہیں جیسے کہ محدث ابن ہبیرہ نے اس حدیث کی شرح میں کل علم فقہ کو اس میں داخل کیا ہے۔

زیر نظر مضمون میں ہم اس حدیث کو ذرا تفصیل سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔﴿مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ﴾ ”جس سے اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ کرتا ہے، اسے دین میں فقاہت دیتا ہے“۔ مسند احمد کی روایت کے الفاظ یوں ہیں:﴿إِذَا أَرَادَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ بِعَبْدٍ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ﴾ ”جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین میں سمجھ عطا کرتا ہے“۔

اس روایت میں ﴿خَيْرًا﴾ کو نکرہ لایا گیا ہے۔ اس کی تنکیر تفخیم کے لیے ہے جو کسی شے کی عظمت اور کثرت کے بیان کے لیے آتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ تفقہ فی الدین پر عظیم اور کثیر خیر ملنے والی ہے۔ چونکہ یہاں تنکیر سیاق شرط میں

واقع ہوئی ہے اس لیے اس میں تعمیم کا معنی بھی پایا جاتا ہے، مطلب یہ کہ خیر سے مراد ہر طرح اور ہر قسم کی خیر ہے۔ مسند احمد کی ایک روایت میں لفظ خیر معرف باللام لایا گیا ہے: ﴿مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ الْخَيْرَ يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ﴾ ”اللہ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین میں سمجھ عطا کرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے تفقہ فی الدین سے نواز تا ہے گویا اسے کل خیر عطا کر دیتا ہے۔

ایک بار نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ ﴿مَنْ خَيْرُ النَّاسِ﴾ ”بہترین لوگ کون سے ہیں“؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿أَفْقَهُهُمْ فِي دِينِ اللهِ، وَأَوْصَلُهُمْ لِرَحِمِهِ﴾ ”جوان میں دین کی زیادہ سمجھ رکھتا ہے اور بہتر صلہ رحمی کرنے والا ہو“۔ (مسند احمد) اس حدیث میں انسان کے بہتر ہونے میں تفقہ فی الدین کا ذکر کیا گیا اور اس کے بعد اس کے اعمال میں سے ایک عمل کا ذکر کیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں سمجھ کی وجہ سے انسان کے اعمال میں درستی پیدا ہوتی ہے۔ اہل خانہ، پڑوس اور دوسرے رشتے داروں حتیٰ کہ دیگر جانداروں کے ساتھ بھی اس کا برتاؤ شریعت کی روشنی میں اچھا ہوتا ہے جس کی وجہ سے خود اس کی اور اس کی وساطت سے دوسروں کی زندگی اچھی گزرتی ہے۔ یہ تو اس کی دنیا کی زندگی کا امن و سکون ہے لیکن دین میں سمجھ اور اس کے مطابق پر سکون زندگی بسر کرنے والے کو بہترین اجر تو آخرت کی زندگی میں ملے گا: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (النحل: ۹۷) ”جو عورت یا مرد نیک عمل کرے اور وہ صاحب ایمان ہو تو ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ان کے اعمال کا انھیں اچھا بدلہ دیں گے“۔

تفقہ فی الدین کی اہمیت اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ انسان کی غایت تخلیق عبادت ہے اور عبادت کا درست اور مقبول ہونا تفقہ پر منحصر ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لا خير في عبادةٍ ليس فيها تفقهٌ (جامع الاصول) اس عبادت میں کوئی خیر نہیں جس میں سمجھ شامل نہیں ہے۔ تفقہ کو عبادت کی خوبی اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ اعمال کی صحت کا دارو مدار ان کی شرائط و ارکان پر ہے اور اس علم کا تعلق فقہ کے ساتھ ہے۔ پس فقہ کی موجودگی عبادت کے درست ہونے کے لیے لازمی ہے۔ محمد ابن الحکیم الترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ” انسان اللہ تعالیٰ کے

احکام و نواہی کے مطابق ہی اس کی عبادت کرتا ہے پس جب انسان اپنی عقل و سمجھ بوجھ کے ذریعے احکام (کی تفصیل) معلوم کرتا ہے تاکہ ان کی پابندی کر سکے تو یہ عمل بھی عبادت میں شامل بلکہ محض عبادت ہی ہے۔ جس انسان کو اللہ کی طرف سے کوئی حکم پہنچے اور وہ اس حکم کی خوبی اور فائدے کو معلوم نہ کر سکے اور جسے کوئی نہی پہنچے اور وہ اس امر ممنوع کی برائی کو معلوم نہ کر سکے تو وہ اندھیرے میں ہے۔ جب انسان حکم الٰہی کی خوبی اور امر ممنوع کی برائی جان لیتا ہے تو حکم پر عمل کرنا اور ممنوع سے رکنا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ وہ دل و ماغ کی پوری قوت اور آمادگی کے ساتھ اس امر و نہی کو اختیار کرتا ہے وہ اس خدائی رہنمائی پر اللہ کا شکر گزار ہوتا ہے اور جو ان چیزوں سے واقف نہ ہو اس کا دل ان احکام کے بارے میں سخت اور اس کے جوارح ان احکام پر عمل میں سست ہوتے ہیں"۔ (نوادر الاصول)

حدیث مبارکہ میں تفقہ فی الدین حاصل کرنے کو باعث خیر و خوبی بتایا گیا تو اب یہ سمجھنا چاہیے کہ جو اس سے اعراض کرے گا وہ گویا اپنی بھلائی سے اعراض کر رہا ہے۔ علامہ نور الدین سندھی رحمہ اللہ (المتوفی:۱۱۳۸ھ) لکھتے ہیں: وَمَنْ لَا فِقْهَ لَهُ وَلَا طَلَبَ فَلَا خَيْرَ لَهُ لِتَنْزِيلِ الْحِرْمَانِ عَنْ خَيْرِ الْفِقْهِ مَنْزِلَةَ الْحِرْمَانِ عَنْ مُطْلَقِ الْخَيْرِ (حاشية على ابن ماجه) "جسے فقہ حاصل نہیں ہے اور نہ ہی اس کی طلب میں لگا ہے اس کے لیے کچھ خیر نہیں ہے کیونکہ فقاہت سے محرومی کل خیر سے محرومی کے برابر ہے"۔ علامہ کی اس تشریح سے دو صورتیں سامنے آتی ہیں کہ انسان یا تو حاملِ فقہ ہو یا طالبِ فقہ، اس کے علاوہ ہر صورت محرومی ہی کی کوئی شکل ہے۔ اس مفہوم کی تائید دوسری احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے: ﴿الْعَالِمُ وَالْمُتَعَلِّمُ شَرِيكَانِ فِي الأَجْرِ وَلاَ خَيْرَ فِي سَائِرِ النَّاسِ﴾ (سنن ابن ماجه) "عالم اور متعلم اجر میں برابر شریک ہوتے ہیں اور ان کو چھوڑ کر دوسرے تمام لوگوں میں کوئی خیر نہیں ہے"۔

حدیث زیرِ مطالعہ کے ذیل میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَمَفْهُومُ الْحَدِيثِ أَنَّ مَنْ لَمْ يَتَفَقَّهْ فِي الدِّينِ أَيْ يَتَعَلَّمْ قَوَاعِدَ الْإِسْلَامِ وَمَا يَتَّصِلُ بِهَا مِنَ الْفُرُوعِ فَقَدْ حُرِمَ الْخَيْرَ: (فتح الباري) "حدیث کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ جو شخص دین میں فقاہت پیدا نہ کرے یعنی اسلام کے قواعد و اصول اور فروعی احکام نہ سیکھے تو وہ

کل خیر سے محروم ہو گیا"۔

فقہ کی تعریف

فقہ کسی چیز کے گہرے، پختہ اور مبنی بر ذہانت علم کو کہتے ہیں۔ قلیل الفاظ سے کثیر معنی اخذ کرنے کو بھی فقہ کہا گیا ہے۔ امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ معلوم پر غور وفکر کے ذریعے غیر معلوم تک پہنچنے کا نام فقہ ہے اور اسی لیے یہ علم سے الگ اور برتر شے ہے۔ گویا علم عام ہے اور فقہ خاص ہے اور علم شریعت کو فقہ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ علم کلام خداوندی اور کلام النبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی معرفت پر مشتمل ہوتا ہے۔ علم فقہ، لغت اور نحو وغیرہ کے علم سے ممتاز ہے اس لیے کہ علمِ فقہ شرعی دلائل اور اصول قیاس واجتہاد اور گہرے غور وفکر پر مبنی ہوتا ہے جبکہ لغت اور نحو وغیرہ کا تعلق استنباط و تفکر سے نہیں بلکہ ان کی بنیاد سماع پر ہے۔ (ملخصا الكليات معجم في المصطلحات أبو البقاء الحنفي (المتوفی:۱۰۹۴ھ)

فقہ کے اصطلاحی معنی

اصطلاح فقہ کے دو معنی ہیں۔ ایک اس کا عام اصطلاحی معنی ہے اور ایک خاص اصطلاحی معنی ہے۔ فقہ کی عام اصطلاح میں فقہ سے مراد سے علم دین اور اس کے تمام شعبے مثلاً علم عقیدہ، علم تفسیر، علم حدیث، علم اخلاق مراد لیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فقہ کی اصطلاح کا ایک خاص معنی بھی ہے اس معنی کے اعتبار سے فقہ دین و شریعت کے عملی احکام کو کہا جاتا ہے۔ آج کل فقہ کی اصطلاح سے زیادہ تر یہ دوسرے معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ اسے رائج اصطلاح بھی کہا جاسکتا ہے۔ ذیل میں ہم اصطلاحِ فقہ کے ان دونوں معانی کا تعارف کراتے ہیں۔

اصطلاح فقہ اپنے خاص معنوں میں

فقہ کی اصطلاحی تعریف یوں بیان کی جاتی ہے: الْعِلْمُ بِالأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ الْعَمَلِيَّةِ، الْمُكْتَسَبُ مِنْ أَدِلَّتِهَا التَّفْصِيلِيَّةِ (موسوعہ فقہیہ) "فقہ شریعت کے عملی احکام کے علم کو کہا جاتا ہے جو اس کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا جائے"۔ دلائل سے مراد، قرآن و سنت اور قیاس اور اجماع ہے۔ الْمُكْتَسَب کا لفظی معنی کمایا ہوا ہے لیکن اس سے

مراد وہ علم ہے جو شریعت کے دلائل کی روشنی میں استنباط شدہ ہو، اس لیے ابن الملقن رحمہ اللہ کے ہاں تعریف یوں ہے:الْعِلْمُ بِالْأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ الْعَمَلِيَّةِ النَّاشِئَةِ عَنْ الِاجْتِهَادِ (تحفة المحتاج في شرح المنهاج)

اس تعریف میں الشَّرْعِيَّة کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر مفید اور ضروری علوم جیسے طب اور تعمیر وغیرہ، فقہ میں داخل نہیں ہیں۔ اسی طرح عملیہ کی قید سے علم عقیدہ یعنی علم کلام اور علم اخلاق یعنی سلوک وتصوف کے بارے میں پتا چلا کہ وہ اصطلاحی فقہ میں داخل نہیں ہیں۔ المکتسب یا المستنبط یعنی استنباط شدہ ہونے کی قید سے یہ بتایا جارہا کہ اللہ تعالیٰ کا یا رسول اللہ ﷺ کا علم؛ فقہ میں شامل نہیں ہے، اس لیے کہ وہ وحی ہے جو فقہ سے بالاتر شے اور فقہ کے لیے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے فقہ میں شامل نہیں ہے۔ فقہاء کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لیے فقیہ کے لفظ کا استعمال جائز نہیں ہے۔ اسی طرح ان الفاظ سے ادھر اشارہ کرنا بھی مقصود ہے کہ مقلدین کا علم بھی فقہ میں شامل نہیں ہے بلکہ فقہ تو وہ علم ہے جو(النَّاشِئَة عَنْ الِاجْتِهَادِ)بطرز اجتہاد اور غور وفکر معلوم کیا جاتا ہے۔

اصطلاحی فقہ کا دائرہ

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علم فقہ کا تعلق صرف نماز روزے ہی سے ہے۔ لیکن یہ ان کی لاعلمی ہے۔ الموسوعة الفقهية الكويتية میں اصطلاحی فقہ کا تعارف اس اشکال کے جواب کے طور پر یوں کرایا گیا ہے۔ ”فقہ بندوں کے افعال و اعمال کے بارے میں خدائی احکام کو کہا جاتا ہے اور اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس کے موضوعات کثیر ہیں، بندے اور اس کے رب کے تعلق والے احکام کو عبادات کا نام دیا جاتا ہے چاہے وہ عبادات بدنی ہوں جیسے کہ نماز اور روزہ وغیرہ یا چاہے وہ عبادات مالی ہوں جیسے زکاۃ، یا بدنی اور مالی دونوں کا مجموعہ ہو جیسا کہ حج اور احوال شخصی سے مراد عائلی زندگی کے احکام ہیں جیسے نکاح و طلاق، نفقہ، حضانت، ولایت، نسب، وصیت و وراثت وغیرہ کے احکام۔ فقہ میں معاملات بھی شامل ہیں۔ معاملات وہ احکام کہلاتے ہیں جن کے ذریعے لوگوں کے معاملات کی تنظیم کی جاتی ہے، اسے قانون مدنی یا تجاری بھی کہا جاتا ہے اس میں خرید وفروخت کی جملہ صورتیں اور، رہن، کفالہ، وکالہ، ہبہ اور اجارہ وغیرہ کے احکام شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح حکومت و رعایا کے باہمی تعلق کو قانون دستوری کہا

جاتا ہے اور مسلمانوں کے غیر مسلمانوں کے ساتھ صلح و جنگ کے قوانین کو سِیَر یا قانون دُوَلی کہا جاتا ہے۔ یہ بھی فقہ میں شامل ہیں۔ بندوں کے مالی اور دیگر ہر طرح کے تصرفات کے قانون کو فقہاء نے حظر و اباحت سے موسوم کیا ہے۔ وہ احکامات جن میں جرم اور اس کی سزا اور حدود وغیرہ کا بیان ہے انھیں جنایات یا تعزیرات کہا جاتا ہے۔ اسے قانون جزائی بھی کہا گیا ہے، اسی ذیل میں وہ احکام بھی ہیں جن کے ذریعے قضا اور عدالت، شہادت، دعوی اور ثبوت دعوی کے طریقوں وغیرہ پر بات کی جاتی ہے اسے قانون مرافعات بھی کہا جاتا ہے۔ اس مختصر بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ اسلامی تمام انسانی معاملات سے بحث کرتی ہے اور ان کی رہنمائی سے کسی طرح قاصر نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں کا، غلط طور پر یہ سمجھتے ہوئے کہ فقہ تو محض رب اور اس کے بندے کے درمیان تعلق سے بحث کرتی ہے، یہ نظریہ ہے پس جس کا یہ نظریہ ہے وہ یا جاہل ہے یا کسی وجہ سے جان بوجھ کر فقہ اسلامی اور اس کے موضوعات سے انجان بنتا ہے۔
(الموسوعة الفقهية الكويتية)

اصطلاح فقہ تاریخی تناظر میں

علم فقہ کی مندرجہ بالا تفصیل میں ایک خاص اصطلاح فقہ کا ذکر ہوا جو شریعت کے عملی احکام سے متعلق ہے۔ عرض کیا گیا تھا کہ فقہ کی اصطلاح کا ایک عام معنی مراد بھی ہے جس میں پورا علم دین شامل ہے۔ یہ ایک وسعت کا حامل تصور ہے اور ہماری امت کی ابتدائی ایک دو صدیوں میں، فقہ سے یہی مراد لیا جاتا تھا۔

لیکن بعد میں اصطلاح فقہ، شریعت کے عملی احکام کے لیے استعمال ہونے لگی اور عمومی اصطلاح فقہ کے مفہوم میں شامل علوم دین کے دوسرے شعبوں کے لیے الگ الگ اصطلاحی نام معروف ہونے لگے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب تدوین فقہ میں اس بابت عمدہ کلام کیا ہے آپ لکھتے ہیں: ”وحی و نبوت کے دلالات، اشارات، مضمرات و مقتضیات کا سمجھنا، اسی کا نام فقہ ہے، چاہے ان نتائج کا جو اس ذریعے سے حاصل کیے گئے ہوں دین کے کسی شعبے سے تعلق ہو خواہ ان کا تعلق اعتقادات سے ہو یا وجدانیات سے ہو یا عملیات سے، سبھی پر فقہ کا اطلاق ہوتا تھا مگر بعد کو اصطلاح بدل گئی، ان مسائل میں سے جن کا تعلق اعتقادات سے ہوا، انھیں علم کلام کہنے لگے۔ وجدانیات سے جن کا تعلق ہوا، اسے علم الاخلاق یا تصوف کہنے لگے آخر میں عملیات کا نام فقہ رہ گیا یعنی فقہ یا علم فقہ کا

اطلاق پچھلے دنوں میں عملیات کی چند مخصوص شاخوں تک محدود ہو کر رہ گیا"۔(ص:۱۷۳)

اس عبارت سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وحی و نبوت کی نصوص بعض احکام پر واضح دلالت رکھتی ہیں، اس دلالت کے اصول و ضوابط کے علاوہ، ان احکام کے کچھ اشارات بھی ہوتے ہیں۔ یہ احکام کچھ دیگر امور کا لازمی طور پر تقاضا کرتے ہیں۔ پھر ان احکام سے جڑے، قدرے پوشیدہ تقاضے بھی ہوتے ہیں، تو نصوص کی دلالات کے ساتھ ان مقتضیات و مضمرات واشارات کو سمجھنا بھی فقہ میں داخل ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اصطلاح قدیم کے لحاظ سے علم فقہ میں اعتقادی مسائل، اخلاقی معاملات و اصول اور عملی احکام شامل تھے۔ بعد میں اعتقادی مسائل کو الگ سے مرتب کیا گیا اور ان کے لیے علم کلام کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ اخلاقیات کے لیے ایک الگ سے علم مرتب کیا گیا جسے تصوف کا نام دیا گیا۔ جب یہ دونوں علم فقہ سے الگ ہو کر اپنے مخصوص عنوانات کے تحت مرتب ہو گئے تو اصطلاحی علم فقہ میں عملی احکام ہی باقی بچے اور انہی پر اصطلاح فقہ کا اطلاق ہونے لگا۔ الموسوعة الفقهية الكويتية میں اصطلاح فقہ کا تطور بیان کیا ہے۔ ہم ان کی اس بحث کو اپنے عنوانات کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

اصطلاح فقہ کا پہلا دور

" پہلے دور میں فقہ لفظ شرع کے مرادف ہے، پس جو بھی تعلیمات اور احکام اللہ کی طرف سے دیے گئے چاہے وہ عقیدے و اعتقاد کے متعلق ہوں یا اخلاق یا اعمال قلب کے متعلق ہوں یا افعال جوارح یا اعمال ظاہری کے متعلق ہوں، علم فقہ میں شامل تھے اسی لیے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فقہ کی تعریف یوں کی کہ: هُوَ مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَا لَهَا وَمَا عَلَيْهَا "فقہ معرفت نفس کا نام ہے بہ اعتبار اس کے کہ کیا اس کے حق میں بہتر ہے اور کیا اس کے لیے نقصان کا باعث ہے"۔ اسی لیے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی عقائد کے بارے میں مرتب کردہ کتاب کا نام الفقہ الاکبر ملتا ہے۔

اصطلاح فقہ کا دوسرا دَور

دوسرے دور میں فقہ کی اصطلاح میں کچھ تخصیص واقع ہوئی اور علم عقیدہ کو فقہ کی اصطلاح سے خارج کیا گیا (اس لیے کہ یونانی فلسفے کے حملوں کے نتیجے میں نت نئے اعتقادی مسائل پیدا ہو جانے کے سبب اعتقاد کے شعبے میں خاص

کام کرنا پڑا تو اس کے لیے)علم توحید یا علم کلام اور علم العقیدہ کے نام سے ایک مستقل علم مرتب کیا گیا، اس دور ثانی میں فقہ کی تعریف یہ کی گئی کہ الْعِلْمُ بِالأَحْكَامِ الْفَرْعِيَّةِ الشَّرْعِيَّةِ الْمُسْتَمَدَّةِ مِنْ الأَدِلَّةِ التَّفْصِيلِيَّةِ یہ ایک ایسا علم ہے جو شریعت کے ان فرعی احکام سے بحث کرتا ہے جو دین کے دلائل تفصیلیہ سے ماخوذ ہوں۔

اس تعریف میں احکام کے ساتھ فرعیہ کی قید بڑھائی گئی۔ علم فرعی سے مراد وہ تمام احکام ہیں جو احکام اصلیہ سے الگ ہوں اور اصلیہ سے مراد اعتقادات ہیں کیونکہ شریعت کی اصل اور بنیاد اعتقاد ہی ہے اور کل دین کا مدار اسی پر ہے، تو اس تعریف میں فرعیہ کی قید نے اعتقادات کو الگ کر کے فقہ کو اعمال فرعیہ سے مخصوص کر دیا۔ اب ان اعمال فرعیہ میں تمام احکام عملیہ اور افعال بالجوارح یعنی کرنے کی چیزیں بھی شامل ہیں اور اعمال فرعیہ میں شریعت کے وہ احکام بھی شامل ہیں جو اعمال قلب یا اخلاق سے متعلق ہیں۔ تو اس دور ثانی میں فقہ کی اصطلاح کے مفہوم و مراد میں، اعتقادات نہ تھے لیکن اعمال بالجوارح اور اعمال بالقلب شامل تھے۔

اصطلاح فقہ کا تیسرا دور

فقہ کی اصطلاح کا تیسرا دور وہ ہے جو آج تک چلا آتا ہے، اس میں فقہ کی ایک نئی تعریف کی گئی اور اب تمام علماء اسی رائے پر اعتماد کرتے ہیں۔ اب علماء کے نزدیک فقہ کی تعریف یوں ہے: هُوَ الْعِلْمُ بِالأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ الْفَرْعِيَّةِ الْعَمَلِيَّةِ الْمُسْتَمَدَّةِ مِنْ الأَدِلَّةِ التَّفْصِيلِيَّةِ "فقہ وہ علم ہے جو شریعت کے ان فرعی اور عملی احکام سے متعلق ہے جو دلائل تفصیلیہ سے ماخوذ ہوں"۔ اس تعریف میں سابقہ تعریف پر (اَلْعَمَلِيَّةِ) کی قید کا اضافہ کیا گیا۔ اس تعریف کی رو سے شریعت کے وہ فرعی احکام جو اعمال قلوب و اخلاق سے متعلق تھے، فقہ سے خارج کر دیے گئے۔ اب ان کے لیے ایک الگ مستقل علم مرتب کیا گیا جو علم اخلاق یا علم تصوف کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

دور صحابہ میں جزیات پر فقہ کا اطلاق

فقہ کی یہ تعریف پہلی تعریفات کے مقابلے میں، اپنے اندر محدود علوم کو شامل کرتی ہے یعنی یہ تعریف محض اعمال بالجوارح یعنی کرنے کے کاموں تک محدود ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک نئی تعریف ہے۔ اگرچہ یہ تعریف و مفہوم

محدود ہے لیکن اسے دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعریف سے متضاد نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ دور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جزیات پر لفظ فقہ کے اطلاق کی مثالیں موجود ہیں: کچھ صحابیات رضی اللہ عنہن، آپ ﷺ سے طہارت کے کچھ مسائل پوچھنے آئیں۔ ان کے اس طرز عمل کی تعریف کرتے ہوئے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ﴿نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الأَنْصارِ لَمْ يَكُنْ يَمْنَعُهُنَّ الْحَيَاءُ أَنْ يَتَفَقَّهْنَ فِي الدِّينِ﴾ (صحیح البخاری) اسی طرح حرام و حلال کے مسائل جن پر آج کل عام طور پر لفظ فقہ کا اطلاق ہوتا ہے، دور صحابہ میں بھی ان پر فقہ کا اطلاق پایا جاتا تھا۔ دیکھیں نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی تعریف یوں کی: ﴿أَعْلَمُهُمْ بِالْحَلاَلِ وَالْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ﴾ (ترمذی) ''ان (صحابہ میں سے) حلال و حرام کے سب سے زیادہ جاننے والے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں''۔ اب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی اسی فضیلت علمی کو واضح کرتے ہوئے عمر رضی اللہ عنہ نے لفظ فقہ کا لفظ استعمال کیا ﴿وَمَنْ أَرَادَ أَنْ يَسْأَلَ عَنِ الْفِقْهِ فَلْيَأْتِ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ﴾ (المعجم الاوسط) ''جو فقہ کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ سے رجوع کرے''۔

ان استعمالات سے پتا چلا کہ جزیات دین کے لیے فقہ کا لفظ دور صحابہ میں استعمال ہوا ہے۔ لہذا فقہ کی تعریف کو جزیات تک محدود کرنے کو غیر دینی طرز عمل قرار دینا درست نہیں۔

حدیث زیر مطالعہ میں فقہ سے مراد

ہم اصطلاح فقہ کے اطلاقات جان چکے، لیکن اب سوال یہ ہے کہ حدیث میں فقہ سے مراد کیا ہے؟ احادیث مبارکہ کے ورود با سعود کے وقت فقہ کی وسعت والی تعریف رائج تھی اس لیے احادیث میں وارد، اصلاح ''الفقہ'' سے وہی قدیم اصطلاحی مفہوم لینا چاہیے جو پورے دین کو حاوی ہے۔ علامہ زرقانی رحمہ اللہ شرح موطا میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں وارد لفظ فقہ سے اصطلاحی علم فقہ مراد لینے سے زیادہ بہتر ہے کہ فقہ کا عام مفہوم مراد لیا جائے تاکہ دوسرے علوم اسلامی بھی اس کے ذیل میں داخل ہو سکیں۔ (شرح الزرقانی علی الموطا) پس اس حدیث میں فقہ سے مراد علم دین بحیثیت کل مراد ہے نہ کہ علم دین کا کوئی ایک خاص شعبہ!

جب یہ سمجھ لیا گیا کہ اس حدیث میں فقہ سے مراد جملہ علوم دین ہیں تو جاننا چاہیے کہ جملہ علوم سے کیا مراد ہے؟ شیخ عبدالکریم الخضیر شرح سنن ابن ماجہ کے مقدمے میں فرماتے ہیں علمِ دین میں اسلام، ایمان اور احسان کے علوم شامل ہیں جیسا کہ جبریل علیہ السلام کے سوالات کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے ان تینوں شعبوں کا نام لیا اور فرمایا کہ ﴿فَإِنَّهُ جِبْرِيلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينكُمْ﴾ یہ جبریل تھے جو تمھیں دین سکھانے آئے تھے، پس اسی طرح ہم حدیث ﴿یفقهه في الدين﴾ کو سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے کسی کو دین میں فقاہت دیے جانے کا مطلب ہے کہ اللہ اسے دین کا پختہ فہم دیتا ہے اور اسے دین کے جمیع احکام سکھا دیتا ہے اور اس حدیث میں فقہ سے محض ظاہری احکام کا علم مراد نہیں جو کہ عرف میں فقہ کہلاتا ہے بلکہ تفقہ فی الدین سے مراد دین کے تمام شعبوں کا علم مراد ہے"۔ (شرح مقدمة سنن ابن ماجه)

ایک بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ فقہ کے وسیع معنی یعنی جملہ دینی علوم مراد لینے میں، اصطلاحی علم فقہ یعنی شریعت کے عملی احکام اور ان کے متعلق قیاس و اجتہاد اور فتوی اور ان کی نفی مراد نہیں ہے یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس حدیث میں وارد لفظ فقہ کی مراد میں فقہ الاحکام العملی شامل نہیں ہے بلکہ وہ لا محالہ شامل ہے۔ اس لیے کہ فقہ سے کل علوم مراد لینا عموم ہے جبکہ فقہ سے علم الاحکام مراد لینا خاص ہے اور خاص کو عام میں سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے جب حدیث میں فقہ سے کل علوم دین مراد لیے جائیں گے تو اصطلاحی علم فقہ کل علوم کا حصہ ہوتے ہوئے یقینا شامل مراد رہے گا۔

شیخ عبدالکریم الخضیر تفقہ فی الدین کی وضاحت میں مزید فرماتے ہیں: دین کے طالب علم کو چاہیے کہ فقہ فی الدین کے معنی معلوم کرے، فقہ فی الدین سے مراد دین کے کل ابواب اور شعبوں کا علم ہے۔ کیا یہ مناسب ہے کہ حدیث رسول پاک ﷺ ﴿من یرد الله به خیراً یفقهه في الدين﴾ کے الفاظ سے شریعت کے عملی احکام مراد لیے جائیں اور دوسرے علوم دین سے صرف نظر کیا جائے؟ یقینا یہ مناسب نہیں ہے، بلکہ فقہ سے اولا مراد تو اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے، علماء کے نزدیک یہی الفقہ الاکبر ہے۔ اس کے بعد پھر بقیہ ابواب دین بھی یقینا اس حدیث میں بیان کردہ فقاہت کا

مصداق ہیں۔ اسی لیے جبریل علیہ السلام جب رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور اسلام ایمان اور احسان کے متعلق سوال جواب ہوئے تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا تھا یہ جبریل ہیں جو تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے۔ پس یہ تینوں امور دین میں مجتمع ہیں اور انہی کے علم کا نام فقہ فی الدین ہے۔ اور اگر ان شعبوں کے اجتماع میں خلل در آئے تو دین کے بعض شعبوں کو گرا دینے کے علاوہ اس کا کوئی مطلب نہیں لیا جا سکتا۔ ان ابواب دین میں سر فہرست تو ابواب الرقاق (زہد و تزکیہ) ہیں اور انسان کو اس دنیا کی حقیقت سے روشناس کرانا ہے تاکہ اس میں زہد پیدا ہو، وصیت رسول ﷺ ﴿كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ﴾ ”دنیا میں اس طرح رہو کہ گویا اجنبی ہو یا راہ چلتا مسافر“، عمل و کردار میں ظہور پائے اور زندگی کا نقشہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی تاکید کے مزید مطابق ہو جائے کہ ”جب شام ہو جائے تو صبح کی امید نہ رکھو اور جب صبح ہو جائے تو شام کا انتظار مت کرو بلکہ بیماری سے پہلے کی صحت اور موت سے پہلے والی زندگی کو غنیمت سمجھتے ہوئے توشہ آخرت جمع کرنے میں لگے رہو“۔ (شرح المحرر في الحديث)

عبد الرحمن بن ناصر سعدی رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۳۷۶ھ) حدیث جبریل اور اس میں بیان کردہ، دین کے تین بڑے شعبے اسلام ایمان اور احسان کا حوالہ دینے کے بعد فقہ فی الدین کی وضاحت یوں کرتے ہیں: اولاً تو عقائد اسلامی کی معرفت حاصل کرنا اور عقائد کے باب میں علمائے سلف کے مذاہب کی تحقیق کرنا اور ان عقائد کو ظاہری اور باطنی طور سے اختیار کرنا فقہ فی الدین میں داخل ہے۔ اسی طرح مخالفین سلف کے مذاہب کی تحقیق اور قرآن و سنت کی روشنی میں ان کی غلطی کو واضح کرنا بھی اسی علم العقیدہ کا ایک جزو لازم ہے۔ اس کے بعد فقہ فی الدین میں اصطلاحی علم الفقہ، اس کے اصول و فروع عبادات معاملات اور جنایات وغیرہ کا علم حاصل کرنا بھی شامل ہے۔ مزید یہ کہ تفقہ فی الدین میں ایمان کے حقائق اور سیر الی اللہ و سلوک اور اللہ کی مرضی و موافقت کو حاصل کرنا بھی شامل ہے جس پر قرآن و سنت دلالت کرتے ہیں۔ البتہ اسی کے ذیل میں وہ علوم آلیہ بھی شامل ہیں جو فقہ فی الدین میں معاون ہیں جیسے عربی زبان کے مختلف علوم وغیرہ، پس اللہ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا ہے اسے ان علوم کی تحصیل کی توفیق دیتا ہے۔ اس حدیث کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ جو شخص ان علوم سے اعراض کرے تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ نے اس کے ساتھ خیر کا ارادہ نہیں کیا کیونکہ وہ نیکیوں اور سعادت کے حصول کے اسباب ہی سے محروم رہا“۔ (بهجة قلوب الأبرار وقرة عيون الأخيار في شرح جوامع

الأخبار)

امام ملاعلی القاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث میں فقہ سے مراد اصطلاحی فقہ نہیں ہے جو محض شریعت کے عملی احکام پر مشتمل ہوتی ہے بلکہ اس حدیث میں فقہ سے کل دین مراد ہے جو مشتمل ہے احکام شریعت سمیت طریقت و حقیقت پر بھی(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح)

شارحین کرام کی ان تشریحات کا حاصل یہ ہے کہ حدیث مبارکہ﴿من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين﴾ میں فقہ سے مراد کل علم دین ہے۔اور یہاں لفظ فقہ اپنے قدیمی اور وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے جس کا خلاصہ یہ کہ دین میں گہری اور پختہ سمجھ کو فقہ فی الدین کہتے ہیں اور دین نام ہے اعتقادات، اخلاقیات اور عملیات کا تو دین میں گہری سمجھ سے مراد ہے، اعتقادی احکام یعنی علم کلام کا ماہر ہونا، اور اخلاقی احکام یعنی علم تصوف کا ماہر ہونا اور عملی احکام یعنی فقہی احکام میں مہارت حاصل کرنا، گویا فقیہ وہی ہے جو ان تینوں میں مہارت رکھتا ہو۔

فصل:فقہ کی فضیلت پر مبنی چند احادیث

حدیث زیر مطالعہ میں فقہ کی فضیلت کا بیان تو موجود ہے لیکن نبی اکرم ﷺ نے دیگر فرامین میں بھی اس کی فضیلت کا ذکر کیا ہے ذیل میں ہم چند احادیث کا مطالعہ کریں گے جو ایک طرف تو فقہ کی عظمت و فضیلت کو بیان کرتی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک، علم فقہ کے مندرجہ بالا شعبوں میں سے کسی شعبے پر بھی دلالت کرتی ہے: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:﴿خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِي مُنَافِقٍ، حُسْنُ سَمْتٍ، وَلَا فِقْهٌ فِي الدِّينِ﴾ "منافق دو صفتوں سے محروم ہی رہتا ہے نہ تو اسے حسن سَمت حاصل ہوتا ہے اور نہ فقہ فی الدین"۔(سنن ترمذی)حسن سمت سے مراد حسن سیرت اور حسن اخلاق ہے، امام ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا کہ اس سے مراد نیکی کے کاموں میں رغبت کرنا اور نیک لوگوں کا سا حلیہ و اخلاق اختیار کرنا اور ساتھ ہی ساتھ ظاہری و باطنی عیوب سے اپنی حفاظت کرنا ہے۔(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح)

پیچھے ہم تفصیل سے سمجھ آئے کہ فقہ فی الدین کے تین میدان ہیں ایک عملی احکام کی معرفت حاصل کرنا، دوسرے اعتقادی احکام کی معرفت حاصل کرنا اور تیسرے اخلاقی احکام کی معرفت حاصل کرنا۔اب سوال ہے کہ اس

حدیث میں جس فقہ کا ذکر ہے اور جو منافق کو نصیب نہیں ہوتی وہ ان تین میں سے کون سی ہے ؟ محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس حدیث میں فقہ سے مراد اس کی آخری دو اقسام ہیں یعنی اعتقادات دین کی گہری سمجھ اور اخلاقی احکام واعمال کا علم۔

چونکہ فقہ میں اعتقاد کی پختہ اور گہری سمجھ بھی شامل ہے اور عقیدے کی یہی پختہ سمجھ جب حاصل ہوجائے تو انسان کے دل میں خشیت اور تقوی پیدا ہوتے ہیں پھر انسان کی زبان نیک باتوں میں اور جسم نیک کاموں میں مصروف ہوجاتا ہے۔ تو کہا جاسکتا ہے کہ منافقین معرفتِ اعتقاد یا حسنِ اعتقاد سے محروم ہوتے ہیں اور ان کی اسی محرومی کو فقہ کی محرومی سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ در حقیقت یہ فقہ کی حقیقت سے محرومی ہے۔(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح)

اس حدیث میں فقہ سے کیا مراد ہے یہ تو ہم نے سمجھا لیکن منافق سے کون سے منافق مراد ہے؟ ملا علی القاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَالْمُنَافِقُ إِمَّا حَقِيقِيٌّ وَهُوَ النِّفَاقُ الِاعْتِقَادِيُّ أَوْ مَجَازِيٌّ وَهُوَ الْمُرَائِي وَهُوَ النِّفَاقُ الْعَمَلِيُّ "اس حدیث میں منافق یا حقیقی معنوں میں ہے اور وہ منافق اعتقادی ہوتا ہے یا پھر منافقِ مجازی مراد ہے اور یہ ریاکاری کرنے والا ہوتا ہے جسے منافق عملی بھی کہتے ہیں"۔

منافق حقیقی کی بات تو واضح ہے جب وہ نہ دین کو سچا سمجھتا ہے نہ رسول ﷺ کو دل سے نبی تسلیم کرتا ہے بلکہ وہ تو ایمان کا جھوٹا دعوے دار ہے تو پھر اس کے فقہ عملی یا اعتقادی و اخلاقی سیکھنے کا کیا سوال؟ البتہ اگر منافق سے عملی منافق مراد لیں تو بات کو تھوڑا سا سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک مسلمان جو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور دیگر ضروریات دین پر سچے دل سے ایمان و تصدیق رکھتا ہو لیکن وہ دین نہ سیکھنے کے سبب ایمان کی کمزوری، نفسانی تقاضوں کی منہ زوری اور اخلاقی تربیت کے فقدان کا شکار ہوکر حسن سمت سے محروم ہو اور اس میں منافقوں جیسے اعمال پائے جائیں تو اس مشابہت کی وجہ سے اسے منافق کہہ دیا جاتا ہے، لیکن اس سے مراد منافق عملی ہوتا ہے۔ منافق عملی کافر نہیں ہوتا بلکہ گناہگار مسلمان حقیقی ہوتا ہے۔ مسلمانوں والے حقوق اسے دنیا و آخرت میں حاصل رہتے ہیں البتہ نفاق عملی کی گنہگاری کی سخت سزا ملنے کا سخت خطرہ بہر حال رہتا ہے۔

اس حدیث میں ترہیب ہے اس شخص کے لیے جو دین میں فقہ سے محروم ہو اور اگر اسے حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کرے تو کم از کم درجے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے اس طرز عمل میں منافقین سے مشابہت پائی جاتی ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے پوچھا گیا لوگوں میں عزت والے کون ہیں فرمایا: ﴿أَتْقَاهُمْ لِلَّهِ﴾ "اللہ سے زیادہ ڈرنے والا"، لوگوں نے کہا: ہمارا مطلب یہ نہیں ہے (مطلب یہ کہ ہم خاندانی شرف کے اعتبار سے پوچھتے ہیں)، فرمایا: ﴿فَأَكْرَمُ النَّاسِ يُوسُفُ نَبِيُّ اللهِ ابْنُ نَبِيِّ اللهِ ابْنِ نَبِيِّ اللهِ ابْنِ خَلِيلِ اللهِ﴾ "لوگوں میں سب سے زیادہ عزت والے اللہ کے نبی یوسف ہیں، جو خود بھی نبی ہیں، ایک نبی کے بیٹے ہیں، ان کے داد بھی نبی ہیں جو کہ خلیل اللہ سیدنا ابراہیم علیہم السلام کے بیٹے ہیں"، صحابہ نے عرض کیا: ہم یہ بھی نہیں پوچھ رہے، آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا: ﴿فَعَنْ مَعَادِنِ الْعَرَبِ تَسْأَلُونِي، النَّاسُ مَعَادِنُ(كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ)خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الإِسْلاَمِ إِذَا فَقِهُوا﴾ "اچھا تم عرب خاندانوں کے بارے میں پوچھتے ہو تو جانو لوگ معدنیات کی طرح ہیں جیسے کہ سونے اور چاندی کی کانیں ہوتی ہیں پس جو لوگ ایام جاہلیت میں اچھے تھے وہی اسلام میں بھی اچھے ہوں گے بشرطیکہ دین میں سمجھ پیدا کرلیں"۔ معدن سے مراد استعدادِ اخلاق ہے جو عطیہ خداوندی ہے پس جس طرح مختلف دھاتیں آپس میں متفاوت ہوتی ہیں بعض کی استعداد زیادہ ہوتی ہے اور بعض کی کم اسی طرح لوگ بھی مکارم اخلاق اور محاسن صفات کی استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے متفاوت ہوتے ہیں۔ بعض کی استطاعت زیادہ ہوتی ہے اور بعض کی کم۔ (مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح)

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں رکھے گئے سونے چاندی کے ذخائر کی طرح انسان کی طبیعتوں میں بھی مکارم اخلاق کی صلاحیت و استعداد رکھی گئی ہے۔ پس جس طرح محنت و مشقت کے ذریعے زمین کی معدنیات نکالی جاتی ہیں اسی طرح ریاضت و تزکیہ نفس کے ذریعے مکارم اخلاق کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اس حدیث میں بیان کردہ فقہ سے مراد فقہ اصطلاحی نہیں بلکہ علم دین میں گہری اور پختہ سمجھ مراد ہے اور علم دین سے بھی زیادہ تر اس کے پہلے دو شعبے یعنی علم العقائد اور علم الاخلاق مراد ہے۔ یعنی یہ کہ جس شخص میں نیکی کی فطری استعداد موجود ہے تو پھر وہ اعتقاد اسلام پر پختہ یقین حاصل کرے گا اور اخلاقی اصول و فروع کا علم حاصل کرے گا تو وہ اپنی شخصیت کی تکمیل کر کے بہترین لوگوں کا شرف حاصل کرے گا۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ ﴿خيارهم في الجاهلية﴾ سے

مراد امور جاہلی میں ماہر ہونا نہیں ہے۔ کیونکہ امور جاہلی کو دور جاہلی میں بھی کبھی خیر نہیں سمجھا گیا اور نبی کریم ﷺ بھی اس کے لیے خیر کا لفظ استعمال نہ فرماتے بلکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایام جاہلیت میں استعداد کے حامل تھے۔ جنھوں نے اپنے فطری جوہر خیر کی محافظت کی اور اسے نابود نہیں کیا یا معروف مکارمِ اخلاق سے کسی درجے میں متّصف تھے جب اسلام میں داخل ہوئے اور انھوں نے اسلام کے عقائد اور اعمال کی سچی سمجھ پیدا کر لی اور مزید اچھے اخلاقی مکارم سے بہرہ مند ہوئے تو بہترین لوگ قرار پائے۔(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح)

امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: الفاظ مبارک ﴿إِذَا فَقِهُوا﴾ میں اشارت پائی جاتی ہے کہ شرف اسلامی تفقہ فی الدین کے بنا مکمل نہیں ہوتا (فتح الباري شرح صحيح البخاري)اس لیے اسلام کے بارے میں اپنی دستیاب سمجھ پر قناعت کر کہ بیٹھ نہیں رہنا چاہیے بلکہ اپنی فقاہت فی الدین میں اضافے کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :﴿فَضْلُ الْعِلْمِ خَيْرٌ مِنْ فَضْلِ الْعِبَادَةِ، وَخَيْرُ دِينِكُمُ الْوَرَعُ﴾(المعجم الأوسط و مسند البزار) ”علم میں کثرت عبادت میں کثرت سے بہتر ہے اور بہترین دینداری احتیاط و پرہیز گاری میں ہے“۔ بعض عبادات فرض ہیں ان کی بات نہیں ہو رہی بلکہ نفل عبادت کی بات ہو رہی ہے یعنی ایک آدمی نے ضروری اور فرض عین علم بھی حاصل کر لیا اور فرض عبادات بھی بجالا رہا ہے۔اب اضافی محنت عبادت میں کرے یا علم میں تو حدیث بتاتی ہے کہ اضافی محنت علم کی ترقی میں کرنی چاہیے، اس کی حکمت کی طرف اشارہ ﴿وَخَيْرُ دِينِكُمُ الْوَرَعُ﴾ الفاظ سے کر دیا گیا۔ ورع احتیاط اور پرہیز گاری کو کہتے ہیں۔ پرہیز گاری کا ایک تعلق تو قلبی کیفیات کے ساتھ ہے کہ انسان کے دل میں جتنا خوفِ خدا ہو گا تو اتنا ہی وہ تقوی اختیار کرے گا۔ تقوی کا دوسرا تعلق علم سے ہے۔ انسان کو مشتبہ اور مکروہات کا جتنا علم ہو گا اسی قدر اس کے لیے ان سے بچنے کا امکان بھی ہے۔ اگر بندے کو ان چیزوں کی اصلیت کا علم نہ ہو تو خدا خوفی کے باوجود انسان کے ان چیزوں میں مبتلا ہونے کا امکان رہتا ہے اسی لیے اس حدیث میں علم کو عبادت پر افضل بتایا گیا۔

ایک حدیث میں لفظ فقہ بھی آیا ہے۔﴿أَفْضَلُ العِبَادَةِ الْفِقْهُ﴾ (طبرانی) ” فقہ افضل عبادت ہے

"۔اگرچہ یہ کمزور درجے کی روایت ہے لیکن علم کی مذکورہ فضیلت کی بنیاد مندرجہ بالا حدیث کے علاوہ سنن ترمذی کی حدیث پر بھی ہے: نبی اکرم ﷺ کے سامنے دو بندوں کا ذکر ہوا، ایک ان میں سے عالم جبکہ دوسرا عابد تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلَى أَدْنَاكُمْ﴾ "عالم کی عابد پر فضیلت اتنی ہے جتنی میری فضیلت تم میں سے کسی عام آدمی پر ہے"۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ اپنے کسی حجرے سے نکلے اور مسجد میں داخل ہوئے تو آپ نے دو حلقے ملاحظہ فرمائے ایک حلقے والے قرآن کی تلاوت کر رہے تھے اور اللہ سے دعائیں مانگ رہے تھے اور دوسرے حلقے والے پڑھ پڑھا رہے تھے آپ ﷺ یہ فرما کر تعلیم و تعلم والے حلقے میں تشریف فرما ہوئے: ﴿كُلٌّ عَلَى خَيْرٍ هَؤُلاَءِ يَقْرَءُونَ الْقُرْآنَ وَيَدْعُونَ اللهَ فَإِنْ شَاءَ أَعْطَاهُمْ وَإِنْ شَاءَ مَنَعَهُمْ وَهَؤُلاَءِ يَتَعَلَّمُونَ وَيُعَلِّمُونَ وَإِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا﴾ (سنن ابن ماجه) "دونوں ہی نیکی پر ہیں، یہ جو ہیں یہ قرآن کی قراءت کر رہے ہیں اور اللہ سے دعائیں مانگ رہے ہیں، اگر اللہ چاہے تو عطا کرے چاہے تو نہ کرے اور یہ جو دوسرے ہیں یہ علم سیکھنے سکھانے میں مصروف جبکہ مجھے بھی تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے"۔ سنن دارمی کی روایت میں تعلیم و تعلم والوں کے بارے میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَأَمَّا هَؤُلاَءِ فَيَتَعَلَّمُونَ الْفِقْهَ وَالْعِلْمَ وَيُعَلِّمُونَ الْجَاهِلَ فَهُمْ أَفْضَلُ﴾ "یہ جو ہیں ان میں کچھ فقہ اور علم سیکھ رہے ہیں اور دوسرے ان بے سمجھوں کو سکھا رہے ہیں پس یہ گروہ افضل ہے"۔

ابو موسی الاشعری رضی اللہ عنہ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس عشا کے بعد آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: اس وقت آپ کیسے آئے؟ کہنے لگے میں آپ کے پاس آیا ہوں تاکہ آپ سے کچھ باتیں کروں، انھوں نے حیرت سے کہا: اس وقت؟ ابو موسی رضی اللہ عنہ نے کہا: ﴿إنه فقه﴾ بات تو فقہ کی ہے پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیٹھ گئے اور ان کی طویل بات چیت ہوئی پھر ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا ﴿الصلاة يا أمير المؤمنين﴾ اے امیر المومنین نماز (تہجد)؟ انھوں نے فرمایا ﴿إِنَّا فِي صَلاَةٍ﴾ ہم نماز ہی میں تھے"۔

(مصنف ابن ابی شیبہ)﴿فَقِيهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ﴾ (سنن ترمذي، سنن ابن ماجه) ”شیطان پر ایک ہزار عابد کے مقابلے میں ایک اکیلا فقیہ زیادہ بھاری ہے“۔ حدیث مبارکہ میں شیطان کے مقابلے پر سختی میں ایک فقیہ کو ہزار عابد پر فوقیت دی گئی ہے۔ پہلے تو یہ جاننا چاہیے کہ مذکورہ فوقیت ابتدائی فقہ پر حاصل نہیں ہے اس لیے کہ ابتدائی درجے کا علم فقہ تو ہر عابد بھی ضرور رکھتا ہے بلکہ اس حدیث میں فقیہ سے مراد ماہر فقہ ہے جو فقہ کا تفصیلی و تکمیلی علم رکھتا ہے۔

فقیہ کی عابد پر فضیلت اس لیے ہے کہ فقیہ شیطانی اغوا و وساوس کا داؤ چلنے نہیں دیتا۔ شیطان لوگوں کو شر کا حکم دیتا ہے تو فقیہ لوگوں کو اس کے برعکس خیر کا حکم دیتا ہے۔ شیطان جب بھی لوگوں کے اغوا کے لیے ہوائے نفسانی کا دروازہ کھولتا ہے یا لوگوں کے دلوں میں شہوات کو مزین کر کے دکھاتا ہے تو عارف و فقیہ اپنے تابع مریدین و سالکین کے سامنے شیطانی چالوں کا پردہ چاک کر کے شیطانی راستوں کو بند کر دیتا ہے اور شیطان کو ناکام و نامراد کر دیتا ہے، جبکہ جو محض عابد ہوں وہ اپنی عبادت میں مگن تو رہتے ہیں لیکن لوگوں کی اصلاح نہیں کر سکتے بلکہ کبھی تو خود بھی شیطان سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ تو فقیہ کامل لوگوں کو صراط مستقیم پر چلا کر انھیں شیطانی راستوں سے بچاتا ہے (مرقاۃ المفاتیح) اسی لیے حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ فرماتے ہیں: ﴿اَلْفُقَهَاءُ قَادَةٌ، وَمُجَالَسَتُهُمْ زِيَادَةٌ﴾ ”فقہاء تو قائد و رہنما ہیں اور ان کی مجالست، نیکی میں بڑھوتری کا باعث ہے“۔ (مجمع الزوائد)

ان تشریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس حدیث میں فقیہ سے مراد وہ علمی شخصیت ہے جو احکام کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کا بھی ماہر ہو جو لوگوں کے اعمال ظاہری کے ساتھ ان کی باطنی کیفیات سے واقف اور اصلاح کا سامان کر سکتا ہو اور یہی جامع شخصیت ہے جو شیطان پر ہزار عابد سے بھاری ہے۔ اسی لیے محقق صوفیائے کرام ہمیشہ تصوف واحسان و اصلاح کے ساتھ، علم دین و فقہ پر بھی زور دیتے آئے ہیں تاکہ طریقت و شریعت دونوں کا التزام کیا جا سکے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے القول الجمیل کی نویں فصل کے چند صفحات میں عالم ربانی کی خصوصیات بیان کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے، وہ تفسیر، فقہ، حدیث اور سلوک کا جاننے والا ہو، اپنے متعلقین کو اشغال طریقت کی تلقین کے ساتھ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور وعظ کرتا ہو۔ اس کے بعد حضرت لکھتے ہیں کہ یہی اشخاص ہیں جو نبیوں کے وارث ہیں یہی

لوگ ملکوت آسمانی میں عظیم الشان ہیں جن کے لیے کل خلق اور مچھلیاں تک دعا کرتی ہیں۔ اس کی صحبت کو اکسیر اعظم سمجھنا چاہیے اور اس سے محروم نہ رہنا چاہیے۔ شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے یہ نصیحت کی ہے۔ بعد ازاں یہ وصیت ہے کہ صحبت اختیار نہ کرے صوفیان جاہل اور جاہلان عبادت شعار کی اور نہ ہی فقیہوں کی جو زاہد خشک ہیں اور نہ ہی محدثین ظاہری کی جو فقہ سے عداوت رکھتے ہیں''۔ (القول الجمیل ص: ۱۵۸)

نبی اکرم ﷺ نے اپنی ساتھ بھیجی گئی ہدایت اور علم کی مثال میں تین قسم کے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿إِنَّ مَثَلَ مَا بَعَثَنِيَ اللهُ بِهِ عَزَّ وَجَلَّ مِنَ الْهُدَى، وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَصَابَ أَرْضًا، فَكَانَتْ مِنْهَا طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ، قَبِلَتِ الْمَاءَ فَأَنْبَتَتِ الْكَلأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيرَ، وَكَانَ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ الْمَاءَ، فَنَفَعَ اللهُ بِهَا النَّاسَ، فَشَرِبُوا مِنْهَا وَسَقَوْا وَرَعَوْا، وَأَصَابَ طَائِفَةً مِنْهَا أُخْرَى، إِنَّمَا هِيَ قِيعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً، وَلَا تُنْبِتُ كَلأً، فَذَلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِي دِينِ اللهِ، وَنَفَعَهُ بِمَا بَعَثَنِيَ اللهُ بِهِ، فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذَلِكَ رَأْسًا، وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللهِ الَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ﴾ (مسلم) ''بے شک جس ہدایت اور علم کے ساتھ اللہ نے مجھے مبعوث کیا جیسا کہ بارش کی مثال ہے کہ وہ بارش کسی زمین پر برسی، پس کچھ زمین تو ایسی زرخیز تھی کہ اس نے پانی کو جذب کیا اور اس سے سبزا، اور جڑی بوٹیاں نکلیں (مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے تعلیمات محمدی کے مطابق خود کو بنایا سنوارا اور اپنے عمل میں لائے) پھر اس زمین میں سے کچھ زمین نشیبی تھی جس نے (پھل بوٹے نکالنے کے ساتھ ساتھ) پانی کو اپنے اندر جمع بھی کر لیا تو اللہ نے اس پانی کے ذریعے سے لوگوں کو فائدہ دیا ،انھوں نے خود بھی پیا اور اپنے جانوروں کو بھی کھلایا پلایا، اور یہ بارش ایک دوسری قسم کی زمین پر بھی برسی جو چٹیل تھی ،نہ تو اس نے پانی کو اپنے میں جمع کیا اور نہ ہی سبزہ اگایا، پس اسی طرح کی مثال کہ جس نے دین میں سمجھ پیدا کی اور میرے ساتھ نازل کی گئی ہدایت سے فائدہ اٹھایا، خود بھی علم حاصل کیا اور دوسروں کو بھی علم سکھایا، اور ان لوگوں کی مثال بھی اسی میں ہے جنھوں نے میری طرف سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور میرے ساتھ نازل کی گئی اللہ کی ہدایت کو قبول نہیں کیا''۔

اس حدیث میں ایک لطیف تشبیہ بیان کی گئی ہے۔ یہاں علم کے لیے بارش کی مثال دی گئی کیونکہ جس طرح

بارش آسمان سے اترتی ہے اسی طرح علم وحی بھی آسمان ہی سے نازل کیا جاتا ہے۔اور نبی اکرم ﷺ نے چونکہ اپنے بارے میں فرمایا کہ میں تو بانٹنے والا ہوں، پس آپ حق باری تعالیٰ کی طرف سے اس کی مخلوق تک فیض رسانی فرمانے والے ہیں بالکل کسی بادل کی طرح جو زمین تک پانی پہنچاتا ہے۔اور لوگوں کے دل زمین کے مشابہ ہیں کہ جس طرح بارش تو ہر قسم کی زمین پر پہنچتی ہے لیکن استفادہ طیب اور زرخیز زمین ہی کرتی ہے۔ پس حدیث میں تین قسم کی زمینوں کے بیان کے ذریعے بنیادی طور پر لوگوں کی دو قسمیں بیان ہوئی ہیں۔ایک وہ جنھوں نے دین میں فقاہت حاصل کی اور ایک وہ جنھوں نے علم کی طرف سر تک نہ اٹھا کر دیکھا اور نہ ہی فقاہت حاصل کی۔کیونکہ زمین کی پہلی قسم اور دوسری قسم، ایک اعتبار سے ایک ہی ہیں کہ ان دونوں قسموں نے بارش سے فائدہ اٹھایا ہے۔پس اس حدیث میں بظاہر لوگوں کی دو ہی قسمیں ہیں: ایک وہ جنھوں نے علم اور احکام دین کو قبول کیا اور جنھوں نے قبول نہیں کیا، لیکن چونکہ قبول کرنے والی زمین کی قبولیت میں فرق ہے، کیونکہ ایک زمین وہ ہے جس نے پانی سے سبزہ وغیرہ اگایا جبکہ دوسری نے سبزے کے ساتھ ساتھ پانی کو دوسروں کے لیے جمع بھی کیا۔ اس لیے ان کی دو قسمیں بن گئیں، اسی طرح علم کو قبول کرنے والوں کے قبول کی کیفیت میں فرق کی وجہ سے مزید دو قسمیں بن گئیں: ایک وہ جنھوں اتنا ہی علم جمع کیا جس سے انھوں نے خود ہی فائدہ اٹھایا یعنی اپنے عمل کی حد تک ہی علم حاصل کیا اور درس و تدریس، تربیت و تزکیہ اور فتوی و ارشاد کے درجے کو نہ پہنچ سکے، جبکہ دوسرے وہ جنھوں نے علم کو اس طرح اٹھایا کہ خود عمل کے ساتھ ساتھ درس و تدریس، تربیت و تزکیہ اور فتوی و ارشاد کے درجے کو بھی پا گئے، اور تیسری قسم لوگوں کی وہ ہے جس نے علم کی طرف نظر التفات ڈالنا بھی گوارا نہ کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تین اقسام میں دوسری یعنی درمیانی قسم کے لوگ سب سے افضل ہیں کیونکہ تمام مخلوق ان سے رزق پاتے ہیں اور یہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے والے ہیں پس یہ وہ لوگ ہیں جو خود بھی کامل ہیں اور دوسروں کو بھی درجۂ کمال تک پہنچا کر مکمل کرنے والے ہیں، علم کی طرف سر کا نہ اٹھانا یا تو اس بات سے کنایہ ہے کہ انھوں نے علم کو حاصل تو کیا لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھایا یعنی عمل نہ کیا، یا پھر یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ دنیوی مفاد میں لگ کر انھوں نے علم سرے سے حاصل ہی نہیں کیا، اس قسم کے لوگوں کی مثال اس زمین کی ہے جس نے نہ تو سبزا اُگایا اور نہ ہی پانی کو جمع کیا۔(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح)

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی اور محاکمۂ استشراق

مولانا معراج محمد

گردشِ ایام اور شامت اعمال کے سبب جب عالم اسلام، یورپی ملکوں کی کالونی بنا تو سیاسی و اقتصادی کے ساتھ ساتھ ،اسے عقیدے و نظریے کی سطح پر بھی یلغار کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی مغربی مصنفین نے مشرقی علوم پر تحقیق کی ٹھانی اور ایک شعبۂ علمی '' استشراق '' وجود میں آگیا۔ جہاں ایک طرف بہت سارے مسلمان اہل علم، اپنے '' فاتحین '' کی علمیت سے متاثر ہوئے وہیں بعض رجال العلم نے اِن ''قابضین '' سے علمی مناقشے کا آغاز کیا۔ اس حوالے سے گزشتہ صدی میں جو نابغۂ روزگار شخصیات اسلامی دنیا میں پیدا ہوئیں ان میں ایک اہم شخصیت ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی رحمہ اللہ کی بھی ہے۔ آپ علمائے سلف کی طرح علم و عمل دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔ شام میں اخوان المسلمین کی بنیاد انھوں نے رکھی تھی مگر ان کا اصل کارنامہ امت کا اپنی تہذیب و ثقافت پر اعتماد بحال کرنا، انھیں اپنے اسلامی تشخص پر فخر سکھانا اور مسلمانوں کے علوم اور تہذیب پر سے مستشرقین کی اڑائی ہوئی گرد و غبار صاف کر کے اس کی حقیقی صورت سامنے لانا ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں ہی آپ نے مستشرقین پر کام شروع کیا اور آغاز ہی میں ان کی علمی کمزوریوں کو بھانپ گئے، جس کی تصدیق بعد کی علمی تحقیقات اور مستشرقین کے ساتھ نجی ملاقاتوں نے بھی کر دی۔

اس ضمن میں آپ نے بہت کچھ سپرد قلم کیا۔ انھوں نے اپنی سب سے گراں قدر اور عظیم تصنیف ''السنة ومكانتها في تشريع الإسلامي'' میں ایک باب مستشرقین کی طرف سے سنت پر اٹھائے گئے اعتراضات و اشکالات کے ازالے کے لیے خاص کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے استشراق اور مستشرقین پر الگ سے بھی کام شروع کیا، مگر کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اس سلسلے میں جو کام ہوا تھا وہ ''المستشرقون: مالها وما عليها'' کے عنوان سے طبع ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے استشراق کی تاریخ اور اغراض و مقاصد کے ساتھ ساتھ انصاف پسند اور متعصب مستشرقین کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ان کا یہ کام مختصر ہونے کے باوجود بہت اہم ہے۔ انھوں

نے متاثر مغرب زدہ دانشوروں کا اجمالاً ذکر کیا ہے جن میں سرفہرست ڈاکٹر طہٰ حسین صاحب ہیں، جن کا کہنا ہے کہ ''عربی ادب کے استاد اور ماہر کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا جب تک وہ فرانسیسیوں کے ان نتائج علم کو نہ دیکھ لے، جن تک وہ مشرقی تاریخ وادب اور مختلف زبانوں کے مطالعے سے پہنچ چکے ہیں۔ اور جب تک ہم اپنے قدموں پر کھڑے ہونے اور اپنے پروں پر اڑنے کے قابل ہو کر تاریخ وادب پر اُن کا علمی غلبہ ختم نہیں کر دیتے، اس وقت تک ہمیں اپنا علم (تاریخ وادب اور زبان وغیرہ) انہی سے لینا پڑے گا''۔

ڈاکٹر سباعی صاحب نے اس پر کیا خوب تبصرہ کیا: ''بلا شبہ یہ ہمارے فکری غلامی کے ادوار کی ترجمانی ہے، جس سے ہم اپنے جدید فکری اور علمی ثقافت کے آغاز میں ہوگزرے ہیں''۔ ڈاکٹر صاحب نے طہٰ حسین صاحب کی کتاب ''الأدب الجاهلي''کو مرجلیوث (David Samuel Margoliouth) کی آرا کا ترجمہ قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر علی حسن عبد القادر بھی مغرب سے متاثر تھے۔ ڈاکٹر سباعی نے ان کا بھی محاکمہ بھی کیا اور ان کی تصنیف ''نظرة عامة في تاريخ الفقه الإسلامي'' کو گولڈزیہر (Ignác Goldziher) کی ان تحریروں کا لفظی ترجمہ قرار دیا جو اس کی کتابوں ''دراسات اسلامیہ'' اور ''العقيدة والشريعة في الإسلام''میں ملتی ہیں۔

مصطفیٰ سباعی صاحب نے ڈاکٹر حسن عبد القادر صاحب کے ساتھ اپنے کالج کے دور کا ایک واقعہ بھی زیب قرطاس کیا ہے۔ جو ہمارے مغرب زدہ طبقے کی پوری عکاسی کرتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ علی حسن عبد القادر صاحب جرمنی سے نئے نئے پی ایچ ڈی کر کے آئے تھے۔ جامعہ ازہر میں شیخ مراغی کے دور میں انھیں ہمیں تاریخِ تشریعِ اسلامی پڑھانے کے لیے مقرر کیا گیا۔ سباعی صاحب لکھتے ہیں کہ حسن عبد القادر صاحب کی پہلی گفتگو کچھ اس طرح تھی'' میں تمھیں تاریخِ تشریعِ اسلامی ایسے منفرد علمی انداز سے پڑھاوں گا جس سے ازہر کا کوئی واسطہ بھی نہیں ہوگا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ازہر میں چودہ سال پڑھا ہے مگر اسلام مجھے سمجھ نہیں آیا۔ میں نے اسلام کو جرمنی میں طالب علمی کے زمانے میں سمجھا''۔ ہم طلبہ عالم حیرت میں آپس میں کہتے کہ شاید ہمارے استاد صاحب کوئی ایسی بات جرمنی سے لائے ہوں جس سے ازہر کا کوئی تعلق نہ ہو! بہر حال؛ انھوں نے اپنے سامنے رکھی ہوئی ایک ضخیم کتاب سے ترجمہ کرتے ہوئے سنت نبوی کی تاریخ پڑھانی شروع کی۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ گولڈ زیہر (Ignác Goldziher)

کی ”دراساتِ اسلامیہ“ ہے جس کی عبارات نقل کر کے ہمارے استاد صاحب اس سے علمی حقائق باور کراتے ہیں۔ بہرحال اس طرح سلسلۂ درس جاری رہا اور ہم طلبہ اپنے مبلغِ علم کی حد تک ان کے ساتھ مناقشہ بھی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے امام زہری رحمہ اللہ پر امویین کے لیے حدیث گھڑنے کا الزام لگا دیا۔ ہم نے عرض کیا کہ وہ تو سنت کے امام ہیں، علماء کا مرجع ہیں، مگر وہ اپنی بات پر مصر رہے۔ آخر کار میں نے ان سے گولڈ زیہر (Ignác Goldziher) کی امام زہری سے متعلق پوری تحقیق کا ترجمہ کرنے کا مطالبہ کیا جسے استاد صاحب نے منظور کیا اور متعلقہ حصہ دو، ورقوں میں ترجمہ کر کے مجھے دیا۔ اب میں مختلف مکتبوں میں جاکر امام زہری کی سیرت اور اس مستشرق کے لگائے گئے الزامات کی تحقیق کرتا رہتا۔ اس دوران مکتبہ ازہر اور دارالکتب المصریہ میں کوئی کتاب یا مخطوطہ نہیں چھوڑا، جس میں سے میں نے امام زہری سے متعلقہ مواد جمع نہ کیا ہو۔ میں کالج کے سبق کے اوقات کے بعد سے رات گئے تک اس کام میں مشغول رہتا، یہاں تک کہ تین ماہ گزر گئے۔ جب پوری معلومات جمع ہو گئی تو میں نے اپنے استاد صاحب سے عرض کیا کہ گولڈ زیہر نے امام زہری سے متعلق عبارات میں تحریف کی ہے اور ان کی عبارات نقل کرنے میں خیانت سے کام لیا ہے، مگر جناب استاد کا جواب تھا: ”مستشرقین اور خصوصاً گولڈ زیہر انصاف پسند لوگ ہیں، وہ نصوص اور حقائق میں تبدیلی نہیں کر سکتے“۔

تب میں نے جمعية الهداية الإسلامية میں اس موضوع پر محاضرے کا اہتمام کیا۔ ادارے نے ازہری علماء اور طلبہ کو بھی شرکت کی دعوت دی، حاضری بھرپور رہی۔ اپنے استاد حسن عبدالقادر صاحب کو بھی میں نے شرکت کی دعوت دی اور اپنی معروضات پر رائے کے اظہار کی درخواست کی تھی، چنانچہ انھوں نے یہ دعوت قبول کی اور تشریف لے آئے۔ جب میں نے گفتگو کا اختتام ان الفاظ میں کیا: ” اس مسئلے میں میری یہ رائے ہے اور یہی رائے ہمارے علماء کی بھی ہے۔ اگر ہمارے استاد حسن عبدالقادر صاحب اس پر مناقشہ کرنا چاہتے ہیں تو ان سے تشریف آوری کی درخواست ہے“۔ ڈاکٹر صاحب نے اسٹیج پر تشریف لاکر بر سر مجلس فرمایا: ” میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نہیں جانتا تھا زہری کون ہیں، حقیقت یہ ہے کہ میں نے زہری کو ابھی پہچانا ہے، مجھے آپ کی معروضات پر کوئی اعتراض نہیں“ اور مجلس برخاست ہو گئی۔

کتاب کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں ڈاکٹر سباعی صاحب نے مستشرقین کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی روداد بیان کی ہے، لکھتے ہیں: '' پہلے میری ملاقات جامعہ لندن کے پروفیسر اینڈرسن سے ہوئی۔ یہ پروفیسر صاحب ہمارے کٹر مسلکی طبقے کی طرح ٹھیٹھ مقلد واقع ہوئے تھے۔ کہنے لگے کہ میں نے ایک فاضل ازہر کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے نااہل اس لیے قرار دیا کہ اس نے اپنے مقالے میں اس بات پر دلائل پیش کیے تھے کہ اسلام عورت کو اس کے پورے حقوق دیتا ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا: ''آخر آپ اسے کیسے نااہل کر سکتے ہیں جبکہ آپ لوگ اپنی جامعات میں آزادیٔ فکر کے دعوے دار ہیں''؟ پروفیسر نے جواب دیا: ''کیونکہ وہ از خود ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اسلام نے عورت کو فلاں فلاں حقوق دیے ہیں، تو کیا وہ اسلام کا کوئی مستند ترجمان تھا؟ کیا وہ ابو حنیفہ یا شافعی تھا کہ اسلام کا ترجمان بنا ہوا تھا؟ مزید یہ کہ اس کے نتائج کی تائید میں فقہاء کی تصریحات موجود نہیں تھیں۔ وہ آدمی خود پسندی کا شکار تھا جس کو ابو حنیفہ اور شافعی سے بڑھ کر اسلام سمجھنے کا زعم تھا''۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی صاحب جب آکسفورڈ پہنچے تو وہاں شعبۂ اسلامیات کا سربراہ ایک یہودی تھا جو ٹھیک سے عربی نہیں بول سکتا تھا۔ ڈاکٹر سباعی صاحب کو حیرت ہوئی کہ یہ صاحب طلبہ کو زمخشری کی کشاف سے قرآنی آیات، بخاری و مسلم سے احادیث، حنفی اور حنبلی فقہ کی امہات کتب فقہ کی تدریس کر رہے تھے جبکہ وہ کسی عام رسالے سے عربی عبارت سمجھنے پر قادر نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جب ان سے مطالعہ کے مآخذ کا پوچھا تو گولڈ زیہر (IgnácGoldziher)، مرجلیوث (David Samuel Margoliouth) اور شاخت (Joseph Schacht) کا حوالہ دیا۔ لیڈن (نیدر لینڈ) میں ڈاکٹر صاحب کی ملاقات معروف جرمن یہودی مستشرق شاخت سے ہوئی۔ جب گولڈ زیہر کی غلطیوں کا انھیں بتایا گیا تو پہلے تو وہ مانے ہی نہیں لیکن دلائل اور مثالوں سے بات واضح ہونے کے بعد انھوں نے '' حق آپ کے پاس ہے، گولڈ سے غلطی ہوئی ہے''۔ ڈاکٹر سباعی نے کہا: ''کیا یہ محض غلطی ہے؟''، مسٹر شاخت نے جواب دیا: ''آپ خواہ مخواہ کیوں بدگمانی کرتے ہیں''۔ جب مزید شواہد پیش کیے گئے تو مسٹر شاخت پر غصے کے آثار نظر آنے لگے اور ہاتھ ملنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے گفتگو کے اختتام پر ان سے کہا۔ '' پہلے کوئی مستشرق غلطی کرتا تو عموماً ہم اس کے انتقال کے بعد ہی اس کی غلطی پکڑ پاتے۔ جب تک وہ غلط بات نقل در نقل کے بعد علمی حقیقت کا روپ دھار چکی ہوتی۔ اب ہم غلطی

پکڑنے میں جلدی کرنے لگے ہیں، اب آپ زندگی میں ہی اس کا تدارک کرلیں"۔ اسی ملاقات میں ڈاکٹر صاحب نے مسٹر شاخت کو آگاہ کیا کہ اب آپ جلد از جلد اپنے اسلاف کی اغلاط کا تدارک کیجیے۔

انھوں نے ایک اور بہت انوکھا واقعہ بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر امین مصری نے (جو ازہر کے شعبۂ اُصولِ دین کے فاضل تھے) جامعہ لندن سے شاخت پر تنقیدی مقالہ لکھنا چاہا تو انھیں اجازت نہیں ملی۔ پروفیسر اینڈرسن نے صاف انکار کیا، وہ وہاں سے مایوس ہو کر کیمبرج چلے گئے۔ وہاں انھیں صاف کہا گیا کہ اگر ڈاکٹریٹ کی ڈگری میں کامیابی چاہیے تو مسٹر شاخت پر تنقید سے بچ کر رہنا ہوگا، کیونکہ جامعہ اس کی اجازت نہیں دے گی۔ تب انھوں نے اپنا موضوع بدل لیا۔

کتاب کے آخری حصے میں ڈاکٹر صاحب نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا ہے کہ اگر ہمارے کچھ لوگ مستشرقین کے کام کا اس طرح سے ناقدانہ جائزہ لیں جس طرح انھوں نے ہمارے اسلاف کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ پھر مستشرقین اس کام کو دیکھیں تو انھیں اندازہ ہو سکے کہ جو طریقہ انھوں نے ہمارے دین اور تاریخ میں حقائق دریافت کرنے کے لیے وضع کیا ہے اس سے کیسے نتائج نکلتے ہیں اور اس طرح ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔

آج بھی ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے لوگ حسن عبدالقادر صاحب کی طرح اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ مستشرقین؛ غیر جانب دار، منصف مزاج اور معتدل ہوتے ہیں، اور ان کا رویہ خالص علمی ہوتا ہے، مگر حقائق اس کے برخلاف ہیں، اور استشراق کا گہرا مطالعہ کرنے والے تقریباً تمام اہلِ علم اسی نتیجے پر پہنچے ہیں جو ڈاکٹر سباعی صاحب نے بیان کیا ہے۔

فتاویٰ یسئلونک دار الافتاء و الارشاد

سوال: السلام علیکم ! کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلے کے بارے میں کہ فقہائے احناف گستاخِ رسول کی سزا قتل نہیں کہتے الا یہ کہ وہ مسلمان ہو جو ارتداد کی وجہ سے قتل کی سزا کا حق دار قرار پائے ؟ کیا متقدمین حنفیہ اور متاخرین کی آرا اس سلسلے میں مختلف ہیں ؟ برائے مہربانی رہنمائی فرمائیں۔

جواب: جمہور ائمہ کرام کے نزدیک گستاخِ رسول کی سزا قتل ہے اور اس رائے کے حامل حضرات شوافع اور متاخرین حنفیہ ہیں، جب کہ متقدمینِ حنفیہ کے ہاں گستاخِ رسول کافر ہے۔ اب اگر ذمی شانِ رسالت ﷺ میں گستاخی کرے تو وہ ہر قسم کی سزا کا مستحق ہے اور اگر مسلمان نعوذ باللہ گستاخی کا مرتکب ہو تو وہ مرتد ہو جاتا ہے اور مرتد کے بارے میں راجح مسلک یہی ہے کہ اس سے توبہ طلبی کی جانی چاہیے۔ بس اسی وجہ سے بظاہر فقہ حنفی میں دو آرا پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ گستاخِ رسول سے توبہ طلبی کی جائے اور بغیر توبہ کا موقع دیے اس کو قتل نہ کیا جائے۔ اس رائے کے حامل افراد میں امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد، امام ابوالحسن کرخی، علامہ سعدی، علامہ خیر الدین رملی، علامہ ابن عابدین شامی وغیرہ فقہائے کرام علیہم الرحمہ شامل ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ گستاخِ رسول سے توبہ طلبی نہیں کی جائے گی بلکہ اس کو بغیر توبہ کا موقع دیے قتل کر دیا جائے گا، اس رائے کے حامل حضرات میں علامہ بزازی، محقق ابن ہمام، صاحب خلاصۃ الفتاویٰ ملا خسرو، ابن نجیم، شیخی زادہ، علامہ عینی، علامہ حصکفی، عبدالقادر سندھی، محقق عبدالرحمٰن صاحب مجمع الانہر، علامہ ابوالسعود رومی، علامہ مصطفیٰ بن محمد الطائی، قاضی عبدالواحد، علامہ احمد طحطاوی، علامہ انور شاہ کشمیری اور علامہ ظفر احمد تھانوی علیہم الرحمہ شامل ہیں۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی جس کا نام تنبیہ الولاۃ و الحکام علی أحکام شاتم خیر الأنام ہے۔ اس میں متعدّد بار برسرِعام گستاخیٔ رسول کے مرتکب کی سزا قتل تجویز کی ہے جبکہ جہالت یا دوسری نامعلوم وجوہات کی بنا پر ایک بار گستاخی کے مرتکب کی سزا قیدِ بامشقت ذکر فرمائی ہے اور توبہ نہ کرنے پر عام مرتد کی طرح توبہ طلبی کے بعد قتل کا حکم تحریر فرمایا ہے۔

جدید دور میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ گستاخِ رسول کی سزا صرف قتل تجویز کرنا در حقیقت فقہ حنفی سے عدول کرنے کے مترادف ہے۔ لہذا پاکستان کے آئین میں گستاخیٔ رسول کی سزا جو قتل تجویز کی گئی ہے وہ مبنی بر انصاف نہیں کیوں کہ یہ سزا در اصل ائمہ ثلاثہ کے مذہب کے موافق ہے مذہبِ حنفی کے موافق نہیں۔ یہ بات چند وجوہ کی بنا پر محل نظر ہے:

ا۔ احناف کے ہاں بھی اس کی ضرورت موجود ہے کہ بار بار گستاخی کا ارتکاب کرنے والا عام مرتد نہیں بلکہ زندیق ہوتا ہے اور زندیق کی سزا صرف قتل متعیّن ہے اور عصر حاضر کے گستاخوں کا جو حال ہے اس کے پیشِ نظر ان کی سزا صرف قتل ہی متعیّن ہے۔ متقدمین کے زمانے میں گستاخیٔ رسول کسی مؤمن سے سرزد ہونا ناممکن تھا اس لیے ذمی کی گستاخی کا حکم باب الجزیہ میں اور مسلمان کی گستاخی کا حکم باب المرتد میں ذکر فرمایا، جبکہ متأخرین کے ہاں یہ وبا عام ہوئی تو انھوں نے باب البغاۃ، باب الارتداد اور باب الجزیہ میں اس کی وضاحت فرما کر گستاخِ رسول کی سزا قتل متعیّن فرمائی۔

۲۔ حالات کی وجہ سے احکامات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ بعد کے زمانے میں بالعموم اور آج کے زمانے میں بالخصوص جب کفر بامِ عروج کو پہنچ کر اسلام اور مسلمانوں کو جسمانی اور ذہنی غلامی میں گرفتار کر کے ان سے محبت رسول کا آخری آسرا بھی چھین لینے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ان حالات کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ گستاخیٔ رسول کی سزا صرف قتل ہی مقرر کی جائے۔

۳۔ بہت سے مسائل میں فقہاے احناف نے دوسرے مذاہب سے حکم نقل فرمایا اور اس حکم کو اپنے مذہب کے قواعد کے خلاف نہ ہونے کی وجہ سے اپنا ہی مذہب قرار دیا جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے بہت سے مسائل میں فقہ شافعی سے کسی مسئلے میں کوئی جزئیہ نقل کر کے اس کو اپنا مذہب اس وجہ سے قرار دیا کہ وہ قواعدِ مذہب حنفی کے خلاف نہیں اس طرح زوجۂ مفقود اور دوسرے عائلی مسائل میں دوسرے مذہب پر فتویٰ دیا گیا۔ لہذا آج کے حالات اس بات کا تقاضہ کر رہے ہیں کہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر گستاخِ رسول کی سزا صرف قتل تجویز کی جائے۔

۴۔فقہ حنفی کا ہی اصول یہ بھی ہے کہ حکمِ حاکم رافعِ خلاف ہے۔لہذا جب بفضلہ تعالیٰ پاکستان کے قوانین میں یہ قانون بنادیا گیا کہ گستاخی کی سزا صرف قتل ہو گی تو متقدمین اور متاٴخرین کے اختلاف کو نقل کرنے اور لوگوں کو الجھانے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

لہذا خلاصہ کلام یہ ہے کہ گستاخِ رسول کے معاملے میں فی زمانہ متاٴخرین کے مسلک پر عمل کرنا ہی متعیّن ہے۔

سوال: شاتمِ رسول ﷺ کی سزا کیا ہے؟

جواب: شریعتِ اسلامیہ میں شاتمِ رسول کی سزا قتل ہے، مثال کے طور پر چند روایات ذکر کی جاتی ہیں:

﴿عَنْ عِكْرِمَةَ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ عَبَّاسٍ أَنَّ أَعْمَى كَانَتْ لَهُ أُمُّ وَلَدٍ تَشْتُمُ النَّبِيَّ ﷺ وَتَقَعُ فِيهِ فَيَنْهَاهَا فَلَا تَنْتَهِي وَيَزْجُرُهَا فَلَا تَنْزَجِرُ قَالَ فَلَمَّا كَانَتْ ذَاتَ لَيْلَةٍ جَعَلَتْ تَقَعُ فِي النَّبِيِّ ﷺ وَتَشْتُمُهُ فَأَخَذَ الْمِغْوَلَ فَوَضَعَهُ فِي بَطْنِهَا وَاتَّكَأَ عَلَيْهَا فَقَتَلَهَا فَوَقَعَ بَيْنَ رِجْلَيْهَا طِفْلٌ فَلَطَّخَتْ مَا هُنَاكَ بِالدَّمِ فَلَمَّا أَصْبَحَ ذُكِرَ ذَلِكَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ فَجَمَعَ النَّاسَ فَقَالَ أَنْشُدُ اللهَ رَجُلًا فَعَلَ مَا فَعَلَ لِي عَلَيْهِ حَقٌّ إِلَّا قَامَ فَقَامَ الْأَعْمَى يَتَخَطَّى النَّاسَ وَهُوَ يَتَزَلْزَلُ حَتَّى قَعَدَ بَيْنَ يَدَيْ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللهِ أَنَا صَاحِبُهَا كَانَتْ تَشْتُمُكَ وَتَقَعُ فِيكَ فَأَنْهَاهَا فَلَا تَنْتَهِي وَأَزْجُرُهَا فَلَا تَنْزَجِرُ وَلِي مِنْهَا ابْنَانِ مِثْلُ اللُّؤْلُؤَتَيْنِ وَكَانَتْ بِي رَفِيقَةً فَلَمَّا كَانَ الْبَارِحَةَ جَعَلَتْ تَشْتُمُكَ وَتَقَعُ فِيكَ فَأَخَذْتُ الْمِغْوَلَ فَوَضَعْتُهُ فِي بَطْنِهَا وَاتَّكَأْتُ عَلَيْهَا حَتَّى قَتَلْتُهَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَا اشْهَدُوا أَنَّ دَمَهَا هَدَرٌ﴾ (سنن أبي داؤد، كتاب الحدود، باب الحكم فيمن سب النبي ﷺ)

ترجمہ: ”حضرت عکرمہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ہم سے بیان کیا کہ ایک نابینا کی ام ولد (وہ باندی جس نے مالک کا بچہ جنا ہو) رسول اللہ ﷺ کو برا بھلا کہا کرتی تھی اور (نعوذ باللہ) آپ کی برائی میں مشغول رہتی تھی۔وہ شخص اسے اس سے منع کرتا تھا تو وہ باز نہ آتی تھی اور وہ اسے ڈانٹتا تھا لیکن وہ اس کی ڈانٹ نہیں سنتی

تھی۔ راوی کہتے ہیں کہ ایک رات جب وہ رسول اللہ ﷺ کی ہجو میں پڑی تھی اور آپ ﷺ کو برا بھلا کہہ رہی تھی تو اس کے نابینا مالک نے خنجر لیا اور اس کے پیٹ پر رکھ دیا اور اس پر تکیہ لگا لیا اور اسے قتل کر دیا۔ اس عورت کی ٹانگوں کے درمیان بچہ پڑا ہوا تھا تو وہ وہاں پر خون سے لتھڑ گیا۔ صبح کو جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ ہوا تو آپ نے لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ میں اس شخص کو جس نے اپنے اوپر میرا حق رکھتے ہوئے یہ فعل کیا ہے اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ وہ کھڑا ہو جائے تو وہ نابینا کھڑا ہو گیا اور لوگوں کی گردنیں پھلانگتا لرزتا کانپتا ہوا آیا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں اس عورت کا مالک ہوں وہ آپ کو برا بھلا کہتی تھی اور آپ کی برائی میں پڑی رہا کرتی تھی میں اسے منع بھی کرتا تھا تو وہ باز نہ آئی تھی اور اسے ڈانٹا ڈپٹا تو اس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس سے میرے دو موتیوں جیسے بیٹے ہیں اور وہ میری بڑی اچھی ساتھی تھی گذشتہ رات وہ آپ کو برا بھلا کہنے لگی اور آپ کے بارے میں ایسی ویسی بات کہنے لگی تو میں نے خنجر لے کر اس کے پیٹ پر رکھا اور اس پر تکیہ لگا دیا۔ (زور لگایا) یہاں تک کہ میں نے اسے قتل کر دیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خبردار گواہ رہو اس کا خون ہدر (بیکار اور لغو ہے اس کا قصاص نہیں لیا جائے گا)"۔

﴿عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ يَهُودِيَّةً كَانَتْ تَشْتُمُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَقَعُ فِيهِ فَخَنَقَهَا رَجُلٌ حَتَّى مَاتَتْ فَأَبْطَلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ دَمَهَا﴾ (سنن أبي داؤد، كتاب الحدود، باب الحكم فيمن سب النبي ﷺ)

ترجمہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی عورت رسول اللہ ﷺ کو برا بھلا کہتی تھی اور آپ کی برائی میں پڑی رہتی تھی ایک آدمی نے اس کا گلا گھونٹ دیا حتیٰ کہ وہ مر گئی اور رسول اللہ ﷺ نے اس (عورت) کا خون ہدر (ضائع قرار) دے دیا"۔

﴿عن ابن عمر قال: أتي عمر ابن الخطاب برجل سب رسول الله ﷺ، فقتله، ثم قال: من سب رسول الله ﷺ أو أحدا من الأنبياء فاقتلوه﴾ (كنزالعمال، حرف الفاء، كتاب الفضائل من قسم

الأفعال، باب فضائل النبيﷺ، فضائلة متفرقة)

ترجمہ:"حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو جس نے آنحضرت ﷺ پر سب وشتم کیا تھا قتل فرمادیا اور پھر فرمایا:"جو بھی رسول ﷺ پر یا کسی اور نبی پر سب وشتم کرے تو اسے قتل کر دیا جائے"۔

فقہ حنفی میں شاتمِ رسول ﷺ کی سزا کے متعلق یہ حکم ہے کہ وہ شخص جو اہانتِ رسول ﷺ کا مرتکب ہو کر کافر ہو جائے تو اسے قتل کیا جائے گا اور اس کی معافی ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔(1)

امام مالک علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: جو شخص بھی حضور ﷺ کی توہین کرے، آپ پر عیب لگائے یا آپ ﷺ کی تنقیص کرے، مسلم ہو یا کافر اسے قتل کر دیا جائے اور اس کی معافی قبول نہ کی جائے۔(2)

امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ شاتمِ رسول ﷺ کو قتل کیا جائے گا۔(3)

امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: جو شخص بھی حضور ﷺ کی توہین کرے یا آپ ﷺ میں نقص بیان کرے مسلمان ہو یا کافر اس کی گردن ماردی جائے اور اس سے معافی قبول نہ کی جائے۔(4)

نیز آپ ﷺ نے فتحِ مکہ کے وقت عام معافی کا اعلان فرمایا سوائے ابن زبعری، کعب بن زہیر، حویرث بن نقید، ابن خطل، ابن ابی معیط، نضر بن حارث وغیرہ۔(5) کیونکہ ان تمام لوگوں کے من جملہ جرائم میں سے بنیادی جرم نبی اکرم ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی تھا اور بادشاہِ وقت کی گستاخی پوری ریاست کی گستاخی تصور کی جاتی ہے اور نبی اکرم ﷺ کی گستاخی پوری شریعت کی گستاخی کے مترادف ہے۔

حوالہ جات

1-الْكَافِرُ بِسَبِّ نَبِيٍّ مِنْ الْأَنْبِيَاءِ فَإِنَّهُ يُقْتَلُ حَدًّا وَلَا تُقْبَلُ تَوْبَتُهُ مُطْلَقًا(رد المحتار، كتاب الجهاد، باب المرتد، مطلب توبة اليأس مقبولة)

(ب)(قوله لسبه للأنبياء) المراد الجنس وإلا فهو قد سب نبيا واحدا (قوله ويؤيده) أي يؤيده قتل الكافر الساب (رد المحتار، كتاب الجهاد ، باب العشر والخراج---، فصل في الجزية، مطلب فيما ينتقض به --)

2- وقال ابن القاسم عن مالك: من سب النبيﷺ قتل و لم يستتب قال ابن القاسم : أو شتمه أو عابه أو تنقصه فإنه يقتل كالزنديق و قد فرض الله توقيره- (الصارم المسلول لإبن تيمية، المسألة الرابعة في بيان السب المذكور--، فصل ذكر بعض نصوص العلماء في كفر الساب)

(ب)و كذلك قال مالک في رواية المدنيين عنه: من سب رسول اللهﷺ أو شتمه أو عابه أو تنقصه قتل مسلما كان أو كافرا و لا يستتاب (الصارم المسلول لإبن تيمية، المسألة الرابعة في بيان السب المذكور--، فصل ذكر بعض نصوص العلماء في كفر الساب)

3 -وأما الشافعي فالمنصوص عنه نفسه أن عهده ينتقض بسب النبىﷺ وأنه يقتل (الصارم المسلول لإبن تيمية، المسألة الأولى أن من سب النبىﷺ من مسلم أو كافر--، نص الإمام الشافعي)-

4 - قال الإمام أحمد : كل من شتم النبي عليه الصلاة و السلام أو تنقصه ـ مسلما كان أو كافرا فعليه القتل و أرى أن يقتل و لا يستتاب(الصارم المسلول لإبن تيمية، المسألة الرابعة في بيان السب المذكور--، فصل ذكر بعض نصوص العلماء في كفر الساب)-

5 - و مما يبين ذلك أنه قد كان أمر بقتل من كان يؤذيه بعد فتح مكة ـ مثل ابن الزبعري و كعب بن زهير و الحويرث بن نقيد و ابن خطل و غيرهم ـ مع أمانه لسائر أهل البلد و كذلك أهدر دم أبي سفيان بن الحارث و امتنع من إدخاله عليه و إدخال عبد الله بن أبي أمية لما كانا يقعان في عرضه ـ و قتل ابن أبي معيط و النضر بن الحارث دون غيرهما من الأسرى و سمى من يبذل نفسه في قتله ناصرا لله و رسوله و كان بندب إلى قتل من يؤذيه و يقول: من يكفني عدوي (الصارم المسلول لإبن تيمية، المسألة الثانية أنه يتعين قتله ولا يجوز استرقاقه--، الحدود لا يقيمه إلا الإمام)